تاریخ میلاد - مرتبہ مولوی حافظ حکیم عبد الشکور مرزاپوری مرحوم، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت قدرے بہتر صفحات ۲۰۸، مجلد مع گردپوش، قیمت صہ، پتہ :- الفرقان بکڈپو، ۳۱ نیا گاؤں مغربی (نظیر آباد) لکھنؤ۔

گذشتہ سو سال سے مسلمانوں کے درمیان جو مسائل سخت اختلاف وانتشار کا باعث بنے ہوئے ہیں ان میں ایک میلاد کا مسئلہ بھی ہے، اس کتاب میں اس کا جائزہ لے کر دکھایا گیا ہے کہ مروجہ میلاد کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی، اس پر پہلے کون سی کتاب لکھی گئی، اس کے مصنف نیز میلاد کے بانی اور اس کو فروغ دینے والے کی علمی ودینی حیثیت کیا تھی، پھر رفتہ رفتہ میلاد میں کیا اضافہ ہوتا رہا، مصنف کے خیال میں نفس ذکر ولادت اور مروجہ مجلس میلاد میں بڑا فرق ہے، وہ اول الذکر کو بالاتفاق جائز اور موخر الذکر کو مختلف فیہ بتاتے ہیں، آخر میں یہ بحث کی گئی ہے کہ میلاد کو مطلقاً بند کر دیا جائے یا باقی رکھا جائے تو کس صورت میں؟ مصنف کا خیال ہے کہ اصلاحات کے ساتھ یہ جاری رکھا جاسکتا ہے، یہ کتاب نصف صدی پہلے لکھی گئی تھی، یہ اس کا دوسرا ایڈیشن ہے، جو لوگ واقعی سنجیدگی سے اس مسئلہ کی نوعیت وحقیقت معلوم کرنا چاہتے ہوں، ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ مفید ہے۔

بریلوی فتنہ کا نیا روپ - از مولانا محمد عارف سنبھلی، تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۲۴۸ مجلد مع گردپوش، قیمت بیچ، پتہ :- کتب خانہ الفرقان، ۳۱ نیا گاؤں مغربی، لکھنؤ۔

چند سال قبل اس کتاب کے پہلے ایڈیشن پر معارف میں مفصل تبصرہ کیا گیا تھا، اب دوسرا ایڈیشن مزید اضافہ کے ساتھ شائع ہوا ہے، ارشد القادری صاحب نے اپنی کتاب "زلزلہ" میں علمائے دیوبند پر یہ الزام عاید کیا تھا کہ وہ جن امور کی نبیاء واولیا کی جانب نسبت کو کفر وشرک بتاتے ہیں ان ہی امور کو خود اپنے اکابر کی جانب منسوب کرتے ہیں اور اس میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے، زلزلہ کے جواب میں متعدد کتابیں لکھی گئیں، یہ کتاب سب میں بہتر اور مدلل ہے جو اس فن کے پرانے ماہر مولانا محمد منظور نعمانی کی نگرانی میں لکھی گئی ہے، کاش مسلمان باہمی اختلافات میں الجھ کر اپنی صلاحیتیں ضائع نہ کرتے۔

"ض"

جلد ۱۲۱ ماہ ذی قعدہ ۱۳۹۷ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۷۷ء عدد ۵

مضامین

مقالات

وفیات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

۳۰ اکتوبر سے ۲ نومبر تک علامہ اقبال کی یک صدی سالگرہ کے موقع پر حکومت ہند کی طرف سے دہلی میں ایک بین الاقوامی سمینار ہوا، جس میں ہندوستان کے علاوہ روس، تاجکستان، جرمنی، زیکوسلاویکیہ، آئرلینڈ، مصر، ایران، عراق، اور پاکستان کے مندوبین شریک ہوئے، شروع میں ہندوستان اور پاکستان کے شعراء کا ایک مشاعرہ بھی ہوا، جس میں معلوم نہیں کیوں بہت کم شعراء شریک تھے، لیکن سمینار ہر طرح کامیاب اور خاطر خواہ رہا،

تقسیم ہند کے بعد اقبال بعض حلقوں میں محض اسلامی شاعر اور پاکستان کی تحریک کے بانی سمجھے جانے لگے تھے، اس لئے اُن کو اس ملک میں متفقہ طور پر دنیا کا ایک عظیم شاعر تسلیم نہیں کیا جاتا تھا، لیکن دہلی کے بین الاقوامی سمینار میں وہ دنیا کے ایک عظیم شاعر کے ساتھ عظیم مفکر بھی مان لئے گئے، اس اجتماع میں روسی، زیکوسلاویکی، تاجکی، ایرانی، مصری، عراقی، پاکستانی ہندو اور مسلمان تمام مقالہ نگاروں کا لب و لہجہ بہت ہی خوشگوار تھا، اور اقبال کو اچھی طرح سمجھنے اور سمجھانے کی فضا تھی، تین روز کے اجلاس میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں کہی گئی، ہندوؤں میں اوتا سنگھ جوشی، ان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ملک راج آنند، ڈاکٹر بیچے اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے تقریریں کیں، مقالے پڑھے، مباحثہ میں حصہ لیا اور اقبال کو خاطر خواہ طریقہ پر خراج عقیدت پیش کیا، ڈاکٹر ملک راج آنند نے اپنے مقالے میں اقبال کو ایک عالمگیر شاعر ثابت کیا، اور ڈاکٹر بی بیچے نے اقبال کی شاعری میں عشق کے تخیل پر اپنے مقالے سے بہت ہی خوشگوار فضا پیدا کر دی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد تو اقبال کے عشاق میں ہو گئے ہیں، بلکہ اُن کو اپنا معشوق بلا شرکت غیرے بنانا چاہتے ہیں، انھوں نے اقبال، اسلام اور عصر جدید پر ایک

بہت ہی فاضلانہ مقالہ پڑھا، جو بہت پسند کیا گیا، اس سمینار کے لئے انھوں نے اقبال کی زندگی، تصانیف اور تحریروں کی ایک بہت ہی عمدہ نمائش بڑی خوش سلیقگی اور محنت سے لگائی تھی، جس کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ساری چیزیں سنیما کے سیمیں پردے پر متحرک ہیں،

اڈنبرا یونیورسٹی کے پروفیسر جی. آر. صابری تبریزی نے اپنا مقالہ "موجودہ دنیا میں اقبال کا مقام" کے عنوان سے پڑھا، وہ بھی اس وقت اقبالیات کے بہت بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں، مقالے اور مباحثے میں وہ اقبال کے خلاف کوئی بات بھی سننا پسند نہیں کرتے، اقبال کے اشعار برجستہ پڑھ کر دوسروں کے دلائل رد کر دیتے، مباحثے میں وہی سب سے زیادہ نمایاں رہے، پروفیسر اینے میری شمیل نسلاً جرمن خاتون ہیں، لیکن آج کل ہارورڈ یونیورسٹی میں ہیں، سات زبانیں جانتی ہیں، اسلامی ادب میں بڑی گہری واقفیت رکھتی ہیں، بڑی اچھی مقررہ ہیں، مباحثے میں اُن کی باوقار اور باوزن رائے غور سے سُنی جاتی، اُن کے مقالہ کا عنوان "اقبال اور جرمنی" تھا، روس کے پروفیسر ای. پی. جیلی شیو نے اپنے مقالہ "اقبال اور پشکن" میں روس کے عظیم شاعر پشکن اور اقبال میں بڑی مماثلت دکھانے کی کوشش کی، اڈنبرا یونیورسٹی کے پروفیسر ڈکٹر کرنن نے اقبال کو انقلاب کا ایک پیغمبر بتایا، زیکوسلاویکیہ کے مندوب نے اقبال اور یورپ کے مشہور شاعر بالویر نرلہ کا موازنہ اور مقابلہ بہت ہی دلچسپ انداز میں کیا، جس پر کافی دیر تک بحث بھی رہی، اردن کے ایک نمائندہ پروفیسر جی. پی. پولن کے نے اپنا مقالہ "اقبال اور معاشرتی انصاف" کے عنوان سے پڑھا، روس کے نمائندہ محمد عاصمد کا مقالہ "اقبال اور تاجک شاعری" پر تھا۔

ایران کے نمائندوں نے بھی بڑی فراخدلی سے اقبال کی تعریف کی، وہاں کے پروفیسر محمد رضا جلالی نائنی کے مقالہ کا عنوان "مقام اقبال در زبان و ادبیات فارسی" تھا، ایران کے ایک دوسرے نمائندہ پروفیسر ایم. اے اسلامی ندوشان نے بھی فارسی میں اپنا مقالہ پڑھ کر اقبال سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا، ایران اور عراق کے دو نمائندوں نے عربی اور فارسی میں اقبال کی شان میں نظمیں بھی کہیں، پاکستان کے پانچ نمائندے تھے، ان کے مقالے ان کی قومی زبان اردو میں تھے، اقبال اکیڈمی لاہور کے ڈائرکٹر ڈاکٹر معز الدین کا مقالہ "علامہ اقبال اور عظمت انسانی"

پڑھا، پاکستان کے مشہور اہلِ قلم ڈاکٹر جمیل جالبی کے مقالہ کا عنوان "مطالعۂ اقبال کے نئے گوشے" تھا، وہاں کے مشہور ادیب اور نقاد ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اقبال کی اردو نثر پر اپنا مقالہ پڑھا، ڈاکٹر وحید قریشی نے اقبال کے بعض خطوط کے ذریعہ ان کی شخصیت پر روشنی ڈالی، پاکستانی مندوبین کے مقالے بہت غور سے سُنے گئے اور اُن پر ہر طرف سے اچھی رائے کا اظہار کیا گیا، وہاں سے ایک خاتون عالیہ امام صاحبہ بھی آئی تھیں جن کا مقالہ پسند کیا گیا، دہلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر امیر حسن عابدی کا مقالہ فارسی زبان میں تھا، انھوں نے اقبال کی غزل سرائی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا، انصاری صاحب نے اپنے مقالہ میں یہ دکھایا کہ اقبال کے خیال میں کوئی تضاد نہیں،

راقم کا مقالہ "اقبال اور امیر خسرو" کے عنوان سے تھا، اس میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اقبال یونانی فلسفیوں کی گاڑی کے قلی نہیں بنے بلکہ وہ اسلام کے حکما، صوفیہ اور شعراء سے متاثر رہے، انہی کے بعض اشعار سے ثابت کیا کہ وہ خسرو ہی کی طرح خسروِ ملکِ سخن بننا چاہتے تھے، اپنے اشعار کہتے وقت خسرو کے تازہ اور شیریں نغموں کو سامنے رکھتے اور اللہ تعالیٰ سے شورِ رومی کے ساتھ سوزِ خسرو کے عطا کرنے کی دعا مانگی، اور یہ سوز اُن کو ملا، اسی لئے اُن میں اور امیر خسرو میں صبغۃ اللہی عشقِ رسول، فلسفۂ عشق اور تخیلِ مردِ مومن میں بڑی مماثلت ہے، دونوں عقل کے مقابلہ میں فلسفۂ عشق کو بلند درجہ دیتے ہیں، فرق اتنا ہے کہ اقبال آخر میں عقل و عشق سے مفاہمت کر لیتے ہیں، لیکن خسرو کے یہاں عشق کے دربار میں عقل کی کوئی گنجائش نہیں، اس مقالہ کو سُن کر پروفیسر جی۔ آر صابری تبریزی نے اپنے جن تحسین آمیز خیالات کا اظہار کیا وہی میری محنت کا اصلی صلہ تھا، لنچ کے وقت وہ میرے پاس آئے، میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر بولے اس مقالہ میں شروع سے آخر تک ایمان کی زندگی نظر آئی جو اصل چیز ہے، انھوں نے کہا کہ اس زبان میں بڑی شعریت تھی، کیا آپ شاعر بھی ہیں، میں نے ہنس کر نفی میں جواب دیا، پاکستان کے مندوبین نے کہا کہ مقالہ میں دارالمصنفین کا رنگ اور معیار پوری طرح پر جھلک رہا تھا،

اقبال کے مسئلۂ زمان و مکان کے سلسلہ میں یہ حدیث لا تسبوا الدھر انا الدھر بھی زیرِ بحث آئی جو انھوں نے فرانسیسی مفکر برگساں کو سنائی تھی، ایک صاحب نے یہ اعتراض کیا کہ یہ موضوع حدیث ہے، اس کا جواب اُن کو دیا گیا کہ یہ حدیثِ قدسی ہے اور یہ مسلم اور بخاری شریف میں بھی ہے،

اس سمینار کے جنرل سکریٹری ملک کے مشہور شاعر جناب علی سردار جعفری تھے جنھوں نے استقبالیہ خطبہ میں اپنی دانشوری کا پورا ثبوت دیا، وہ پورے سمینار کے روحِ رواں بنے ہوئے تھے، بڑی خوش سلیقگی سے ساری کارروائی کو انجام تک پہنچایا، تمام مندوبین سے محبت اور حسنِ اخلاق سے پیش آتے رہے، مباحثہ میں کوئی ناخوشگوار بات آنے نہیں دی، اگر کبھی آئی بھی تو اس کو خوش اسلوبی سے روکا، اقبال کے برمحل اور برجستہ اشعار پڑھ کر اپنے وسیع مطالعہ کی داد بھی لی، مشاعرہ میں جہاں اقبال کا ترانہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" پڑھوایا، وہاں اقبال کی نظم لا الٰہ الا اللہ بھی سنوا کر حاضرین کو محظوظ کیا، ان کے ساتھ ڈاکٹر محمد احسن (جواہر لال نہرو یونیورسٹی) ڈاکٹر قمر رئیس (دہلی یونیورسٹی) اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (جامعہ ملیہ) نے بھی پوری تندہی سے اس سمینار کو کامیاب بنانے کی کوشش کی،

اس سمینار میں جو خوشگوار فضا پیدا ہوئی تھی وہ اچانک کل ہند انجمن ترقی اردو کے اردو گھر کی رسم افتتاح کے موقع پر مکدر ہو گئی، جہاں سمینار کے تمام مندوبین خاص طور پر مدعو تھے، انجمن ترقی اردو کے لئے ایک عالی شان عمارت تعمیر ہوئی ہے، اس کا افتتاح ہمارے وزیر اعظم جناب مرارجی ڈیسائی نے کیا، انجمن کے صدر جناب آنند نرائن مُلا نے ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس دیس کی ساری تاریخ دہرا دی جو اردو کے ساتھ حکومتِ ہند کرتا رہا ہے، اس کو سن کر جناب وزیر اعظم کو معلوم نہیں کیوں غصہ آگیا، اور یہ کہہ گئے کہ اس قسم کی باتوں سے اردو کو فائدہ پہنچنے کے بجائے نقصان ہوگا، جناب آنند نرائن مُلا نے جس صاف اور سلیس زبان میں اُن کو مخاطب کیا تھا وہ بھی اُن کو پسند نہیں آئی اور کہا کہ ایسی سخت زبان ملک میں نہیں چل سکتی، اور یہ الزام بھی رکھ دیا کہ اردو زبان سخت ہو گئی ہے تو اسی ردِ عمل میں ہندی بھی سخت ہوتی جارہی ہے، اور یہ بھی فرمایا کہ مسلم لیگ اس کو اپنی زبان قرار دے کر اس کے معاملہ کو خراب کر چکی ہے، وہ آئین کی کسی دفعہ کے مطابق کسی ریاستی حکومت کو اردو کے سلسلہ میں خصوصی سلوک کرنے کی ہدایت نہیں دے سکتے،

ایک وزیر اعظم ہر زبان کے بولنے والے طبقہ کا وزیر اعظم ہوتا ہے، وہ کسی وجہ سے کسی طبقہ کی خواہش پوری نہیں کر سکتا تو اس کی حوصلہ شکنی اور دل آزاری کرنا بھی اس کے ذمہ دار عہدہ کے لئے مناسب نہیں، وہ اس کے قائل ہیں کہ جمہوریت اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہر فرد کو آزادی سے اپنی رائے کے ظاہر کرنے کا حق نہ ہو

جناب آنند نرائن ملا کو ان کے سامنے اردو بولنے والوں کے مجروح جذبات کی ترجمانی کا پورا آئینی حق تھا، اس پر

ہمارے وزیر اعظم کی برہمی، اور جھلاہٹ اُن کے تدبر کے بالکل منافی تھی،

پچھلے ستمبر میں دہلی گیا تھا تو مولانا امداد صابری کی اردو صحافت نگاری کی ایک جلد کی رسم اجرا غالب اکیڈمی

میں تھی اس تقریب کا افتتاح حکومت ہند کے وزیر اطلاعات جناب ل۔ کے۔ اڈوانی نے کیا تھا اس موقع پر

ملک کے مشہور صحافی جناب کلدیپ نائر نے ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے اردو کی حمایت میں کہا تھا کہ نسیم سحری جیسی لطیف

اور شفقت مادری جیسی پیاری زبان کو ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اس کا حق اسی وقت تسلیم کرایا جا سکتا ہے جب اس کیلئے

زبردست ایجی ٹیشن کیا جائے اس کا جواب جناب ل۔ کے۔ اڈوانی نے بڑی بردباری اور ٹھنڈک سے دیا کہ ملک میں اردو اخبارات

کی تعداد ہندی اور انگریزی کے بعد ہی ہے بلکہ اردو ہفتہ وار اخبارات کی تعداد ملک میں سب سے زیادہ ہے وہ اردو اخبارات کے حق کو

کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں اُن کی ترقی میں وہ ہر طرح کی مدد پہونچاتے رہیں گے، مجمع اُن کی اس تقریر سے خوش تھا،

اس تقریب میں جناب ہیم وتی نندن بہوگنا وزیر حکومت ہند بھی موجود تھے انھوں نے اردو کی حمایت میں ایک

پرجوش تقریر کی بڑی صاف گوئی سے بتایا کہ یوپی میں جب ہندی ذریعۂ تعلیم بنائی گئی اور اس کا نصاب تیار ہوا تو اس

زمانہ کے وزیر تعلیم کو ایک بڑے ہی لیڈر نے لکھا کہ اس نصاب کے بعد آیندہ تیس برس میں اردو یو۔ پی میں ختم ہو جائے گی وزیر تعلیم نے

جواب دیا کہ وہ اُن کے دل کی بات کو خوب سمجھے اجناب بہوگنا نے یہ بھی کہا کہ اس زبان کو ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی

مگر یہ اب تک زندہ ہے، اور پہلے سے زیادہ اس میں زندگی آتی جا رہی ہے انھوں نے یہ بھی کہا کہ دراصل اردو اور ہندی

کا کوئی جھگڑا نہیں ہے بلکہ اردو اور ناسمجھی کا جھگڑا ہے جب یہ ناسمجھی ختم ہو جائیگی تو یہ جھگڑا بھی جاتا رہے گا،

تالیوں کی گونج میں وہ یہ بھی بولے کہ خود حکومت کو اردو کے مسئلہ پر نظر ثانی کرنی ہوگی، خدا کرے

ہمارے وزیر اعظم صاحب اپنے ایک اہم اور ممتاز وزیر کی اس رائے کو قابل توجہ سمجھیں اردو

بولنے والوں کو بھی اپنی خودداری، غیرت اور عزت نفس کا جائزہ از سر نو لینا ہے کسی زبان کو

دریوزہ گری کر کے زندہ رہنے کا حق حاصل نہیں،

مقالات

امیر خسروؒ بحیثیت ایک صوفی

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۲)

حضرت خواجہ کو امیر خسروؒ سے جو محبت اور شیفتگی رہی، یا امیر خسروؒ کو حضرت خواجہؒ سے جو ہوا نست

اور فریفتگی رہی، وہی امیر خسرو کے تصوف کی دل آویز اور دلپذیر کہانی ہے جس کو سیر الاولیا کے

مصنف نے حضرت خواجہ کی زبانی بیان کرکے اس میں عارفانہ رنگ پیدا کر دیا ہے،

حضرت خواجہ نے فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ مندہ پل کے پاس شیخ نجیب الدین

متوکلؒ کے گھر کے دروازہ کے نزدیک بہت پاک صاف پانی بہ رہا ہے خسرو ایک اونچی دکان

پر بیٹھے دکھائی دیئے ہیں بہت خوش اور مسرور نظر آرہا ہوں، میرے دل میں یہ بات پیدا ہوئی

کہ اس وقت خسروؒ کے لئے خدا سے وہی چیز مانگوں جو میں چاہتا ہوں، میرا خیال ہے کہ میری دعا

قبول کی گئی، اور خسرو میں وہی کیفیت پیدا ہوگئی، (ص ۳۰۳)

ایک اور موقع پر حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ ایک روز خسرو کے لئے دعا کرتے وقت یہ خیال آیا

کہ خسروؒ درویشوں کا نام نہیں ہوا کرتا ہے، خسرو کو محمد کاسہ لیس کے نام سے پکارنا چاہئے، خسرو سے

جب اس کا ذکر آیا تو انھوں نے کہا کہ میرے لئے یہ خطاب غیب سے آیا ہے، اور گویا رسول اللہ صلعم

نے اس کی خبر دی ہے، اس سے مجھ کو ابدی نعمتوں کی امیدیں ہوگئی ہیں، (ص ۳۰۳)

حضرت خواجہ نے امیر خسروؒ سے فرمایا کہ میرے لئے دعا کرو، کیونکہ تمھاری بقا میرے اوپر منحصر ہے، میری بقا کے لئے تم کو میرے پہلو میں دفن کرنا چاہئے، یہ بات لوگوں نے کئی بار حضرت خواجہ کو یاد دلائی تو فرمایا ایسا ہی ہوگا، (ص ۳۰۳)

حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ میں نے خدائے تعالیٰ سے عہد کیا ہے کہ اگر مجھ کو بہشت بھیجا جائیگا تو خسرو کے ساتھ جاؤں گا، (ص ۳۰۳)

ایک اور موقع پر حضرت خواجہؒ نے امیر خسروؒ سے فرمایا کہ میں نے جمعہ کی رات کو خواب میں دیکھا کہ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ کے بیٹے شیخ صدر الدینؒ تشریف لائے، تو میں نے بڑھ کر ان کی اتنی تواضع کی، کہ بیان نہیں کیا جاسکتا، ہو یکایک تم (یعنی امیر خسرو) دور سے نظر آئے اور میرے پاس پہنچ گئے، اور معرفت کی باتیں شروع کر دیں، اسی کے بعد موذن نے فجر کی نماز کی اذان دی، تو میں نیند سے بیدار ہوگیا، اس خواب کو بیان کر کے حضرت خواجہؒ نے خسرو سے فرمایا، دیکھو تم کو کیا رتبہ مل گیا ہے، خسروؒ کا بیان ہے کہ یہ سن کر میں نے اپنی نیازمندی میں عرض کیا کہ مجھ جھاڑو دینے والے کو یہ سب کچھ آپ ہی کا دیا ہوا ہے، یہ سن کر حضرت خواجہؒ پر گریہ طاری ہوگیا، پھر زور زور سے رونے لگے، خسرو پر بھی گریہ طاری ہوگیا، اس کے بعد حضرت خواجہؒ نے اپنی کلاہ خاص اپنے دست مبارک سے خسروؒ کو پہنائی، اور فرمایا کہ مشائخ کی باتوں کا لحاظ رکھا کرو، (ص ۳۰۴)

سیر الاولیاء کے مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ امیر خسروؒ کو حضرت خواجہؒ نے ترک اللہ کا خطاب ایک کاغذ پر لکھ کر دیا تھا خسروؒ نے اس کو تعویذ بنا کر رکھا تھا، اور ہدایت دی تھی کہ اس کو ان کی قبر میں رکھ دیا جائے، اسی کی بدولت قیامت میں ان کی بخشائش ہو جائے گی، (ص ۳۰۳)

پھر ایک منقبت میں بھی اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے،

بر زبانت چو خطاب بندہ ترک اللہ رفت

دست ترک اللہ گیر و ہم بہ اللہش سپار

امیر خسرو ایک فطری شاعر بھی تھے، اپنی صغر سنی ہی میں اساتذۂ فن کے تتبع میں اشعار کہنے شروع کر دیئے تھے، جو کچھ منظوم کرتے حضرت خواجہ کی خدمت میں پیش کرتے، وہ اپنی شاعری کے سارے کمالات کو محض اپنے مرشد کے لعاب دہن کی برکت سمجھتے، مثنوی نہ سپہر میں اپنے مرشد کی شان میں جو منقبت لکھی ہے، اس میں کہتے ہیں:-

من ازوے لعاب دہن یافتم — کزیں گونہ آب دہاں یافتم

ایک روز حضرت خواجہ نے امیر خسرو سے کہا کہ معشوقوں کے زلف و خال کے ساتھ اصفہان کے شعراء کے طرز میں عشق انگیز کلام کہا کرو۔ امیر خسرو نے انھی دلآویز صفات کے ساتھ اپنا کلام کہنا شروع کیا، اور اس کو انتہائے کمال تک پہنچا دیا، (سیر الاولیاء ص ۳۰۱)

ایک بار امیر خسرو نے حضرت خواجہؒ کی مدح میں ایک منقبت لکھی، اور جب اس کو سنایا تو حضرت خواجہؒ نے فرمایا: کیا صلہ چاہتے ہو" خسرو نے جواب دیا" کلام میں شیرینی" اس وقت حضرت خواجہؒ کی چارپائی کے نیچے ایک طشت میں شکر رکھی تھی، انھوں نے خسرو سے یہ طشت منگوائی اور ان سے کہا اپنے سر کے اوپر چھڑک لو، اور کچھ کھا بھی لو، اس کے بعد ہی ان کے کلام میں بڑی شیرینی پیدا ہوگئی، امیر خسروؒ آخر عمر میں پچھتایا کرتے، کہ کوئی اور بہتر صلہ مانگتا تو وہی ملتا، (سیر الاولیاء ص ۲-۳۰۱)

حضرت خواجہؒ نے اپنے محبوب مرید کی شاعری سے متعلق یہ اشعار لکھ کر اپنی شفقت کا اظہار کیا ہے، (سیر الاولیاء ص ۳۰۴)

خسرو کہ بہ نظم و نثر مثلش کم خاست — ملکیت ملکِ سخن آن خسرو راست

آن خسرو ماست ناصر خسرو نیست — زیرا کہ خدائے ناصر خسرو راست

اور واقعی خدا خسرو کا ناصر و حامی بنا رہا، وہ جب کوئی کتاب لکھتے تو حضرت خواجہؒ کی خدمت میں پیش کرتے، وہ اس کو ہاتھ میں لے کر اس پر فاتحہ (فاتحۃ الکتاب) پڑھتے، خسرو اور اُن کے قدر دانوں کا بیان ہے کہ اسی وجہ سے ان میں کمال پیدا ہوتا گیا،

(سیر الاولیا ص ۳۰۲)

حضرت خواجہؒ کو یہ بھی خیال رہا کہ کہیں امیر خسروؒ شعر و شاعری میں پڑ کر اسی میں الجھ کر نہ رہ جائیں، اس لئے اُن کو اس سے بھی بہتر کام میں لگایا، ان کی ہدایت کے مطابق تہجد کے وقت امیر خسروؒ کلام پاک کے سات پارے پڑھنے لگے، ایک روز حضرت خواجہؒ نے اُن سے پوچھا ترک! تمھارا کیا حال ہے، خسرو نے جواب دیا کہ اب رات کے آخری حصہ میں گریہ طاری رہتا ہے، یہ سُن کر حضرت خواجہؒ نے فرمایا" الحمد للہ اب تم کچھ ظاہر ہونے لگے،

(سیر الاولیا ص ۳۰۲)

امیر خسرو نے معشوقوں کے زلف و خال کے ساتھ جس طرز میں عشق مجازی کا راگ الاپنا شروع کیا تھا، وہ حضرت خواجہؒ کی صحبت میں رہتے رہتے عشقِ الٰہی میں بدل گیا، رفتہ رفتہ اس میں ایسا سوز پیدا ہو گیا کہ حضرت خواجہ کو اس ترک بچہ کے سوز سینہ پر فخر ہونے لگا اور اُن کے اشعار سن کر مست ہو جاتے، ایک بار امیر خسروؒ اُن کے سامنے اپنی ایک غزل گانے لگے جب اس شعر پر پہونچے،

رخ جملہ را نمود و مرا گفت تو مبیں — زیں ذوق مست و بے خبرم کیں سخن چہ بود

تو حضرت خواجہؒ نے نگاہِ محبت سے ان کو دیکھا، بے خود ہو گئے، اور اُن پر گریہ طاری ہو گیا،

امیر خسرو اس شعر کو بار بار گاتے رہے، (سیر الاولیا ص ۵۱۶)

ایک اور موقع پر امیر خسروؒ کے صاحبزادے امیر حاجی نے اُن کی ایک غزل حضرت خواجہؒ کے سامنے شروع کی، اور جب یہ شعر سُنایا تو

خسرو تو کیستی کہ در آئی دریں شمار
کیں عشق تیغ بر سر مردانِ دیں زدہ است

تو حضرت خواجہؒ پر وجد طاری ہو گیا، اور جب امیر حاجی نے اس کو بار بار دہرایا تو حضرت خواجہ نے اسی وجد و کیف میں اپنی ایک دستار امیر حاجی اور ایک امیر خسرو کو دیدی؛

(سیر الاولیا ص ۵۱۶ - ۵۱۵)

سیر الاولیا میں تو نہیں لیکن سفینۃ الاولیا میں ہے، کہ حضرت خواجہؒ فرمایا کرتے کہ قیامت کے روز مجھ سے پوچھا جائے گا کہ کیا لائے تو میں کہوں گا کہ یہ ترک اللہ کا سوزِ سینہ،

(سفینۃ الاولیا ص ۱۰۰)

حضرت خواجہؒ کو امیر خسروؒ سے ایسا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا کہ ان کے حضور میں جانے کی ہمت جب کسی کی نہ ہوتی، تو اُس وقت وہی اُن کے پاس بھیجے جاتے، حضرت شیخ برہان الدین غریبؒ حضرت خواجہؒ کے بڑے محبوب مرید تھے، اُن کو خلافت بھی عطا کی تھی، اور رشد و ہدایت کی غرض سے سات ہمراہیوں کے ساتھ دولت آباد بھی بھیجا، جب وہ حضرت خواجہؒ سے روحانی تعلیم پا رہے تھے، تو کچھ لوگوں نے حضرت خواجہؒ سے بیان کیا کہ وہ یعنی شیخ برہان الدین غریبؒ مشائخ کی طرح کمبل کو دوتہ کر کے سجادے پر بیٹھتے ہیں، حضرت خواجہ کو اُن کی نشست کا یہ طریقہ ناگوار گذرا، جب وہ اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو اُن سے مخاطب ہونا پسند نہیں فرمایا، اور جب جماعت خانہ میں تشریف لائے تو اپنے خادم اقبال سے اُن کو یہ کہلا بھیجا کہ وہ

جماعت خانہ میں نہ بیٹھیں، وہ یہ سن کر پریشان ہوئے، گھر جا کر سوگ میں بیٹھ گئے، برابر روتے رہتے، لوگ ان کی عیادت کے لئے آتے، ان کو روتا دیکھ کر خود بھی رونے لگتے۔ امیر خسروؒ بھی ان کی حالت زار سے متاثر ہوئے تو اپنی دستار گردن میں لٹکائی اور حضرت خواجہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت خواجہؒ نے ان کو اس طرح دیکھا تو پوچھا: "ترک کیا ہے؟" عرض کیا: "مولانا برہان الدینؒ کی معافی چاہتا ہوں"! مسکرا کر پوچھا: "مولانا برہان الدینؒ کہاں ہیں؟" امیر خسروؒ نے مولانا برہان الدینؒ کو بھی ان کی دستار گردن میں ڈال کر صفِ نعال میں کھڑا کر دیا، پھر تو حضرت خواجہؒ نے تقصیر معاف کر دی اور تجدید بیعت سے مشرف کیا۔

(سیر الاولیاء ص ۸۱ - ۲۷۹)

حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ بھی حضرت خواجہؒ کے بہت ہی چہیتے مرید تھے، دہلی میں انہی نے ان کی جانشینی کی۔ جب روحانی تربیت پا رہے تھے تو ان کے دل پر جو کیفیت گذر رہی تھی اس کا حال خود اپنے مرشد سے نہ کہہ سکے، امیر خسرو ہی نے جا کر ان کی طرف سے عرض حال کیا جیسا کہ آگے ذکر آئے گا۔

سیر الاولیاء ہی کے مصنف کا بیان ہے کہ ایک بار ایک شخص نے بڑی جرأت کے ساتھ حضرت شیخ المشائخؒ سے کہا کہ جس نظر سے آپ امیر خسروؒ کو دیکھتے ہیں اسی نظر سے مجھے بھی دیکھ لیجئے، شیخ المشائخ نے تو کوئی جواب نہیں دیا لیکن خسرو کو خیال آیا کہ میں اس کو یہ جواب دوں کہ پہلے ویسی صلاحیت پیدا کرو (ص ۳۰۲)

امیر خسروؒ کو حضرت خواجہؒ سے جو عشق رہا، اس کا ذکر تو ان کے پیر بھائی یعنی سیر الاولیاء کے مصنف نے بہت کیا ہے جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بیان ہوا، بعد کے تذکروں میں بھی اس عشق و محبت کی داستانیں بہت کچھ ملتی ہیں جو یا تو امیر خسرو کے ان معاصر تذکروں سے لی گئی ہیں،

جواب ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ یا بزرگوں کے سینہ بہ سینہ جو روایتیں چلی آ رہی ہیں ان کو قلمبند کر دیا گیا ہے۔

امیر خسروؒ اپنے مرشد کی ہر ادا اور ہر بات پر جان چھڑکتے، اخبار الاخیار (ص ۵۵) میں ہے کہ حضرت خواجہؒ رات بھر اپنے حجرہ میں عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے جس سے ان پر غیر معمولی کیف و مستی اور بے خودی و وارفتگی طاری رہتی، ایک روز امیر خسروؒ صبح کے وقت حضرت خواجہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو شغل باطن سے ان کی آنکھیں سرخ تھیں، ان خمار آلود آنکھوں کو دیکھ کر امیر خسرو مست ہو گئے اور یہ شعر برجستہ کہا:

تو شبانہ می نمائی بہ بر کہ بودی امشب

کہ ہنوز چشمِ مستت اثر خمار دارد

تزک جہانگیری (ص ۸۱ مطبوعہ علی گڑھ) میں ہے کہ ایک بار حضرت خواجہؒ جمنا کے کنارے آ کر کھڑے ہو گئے، تو دیکھا کہ ہندو اپنے کسی تہوار کے موقع پر جوق در جوق اس خیال سے غسل کر رہے ہیں کہ ان کو ثواب حاصل ہو گا، خسرو بھی ان کی معیت میں تھے، حضرت خواجہؒ نے ہندوؤں کے مذہبی شغف اور انہماک کو دیکھ کر امیر خسرو سے مخاطب ہو کر فرمایا:

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

حضرت خواجہؒ کے سر مبارک پر اس وقت ٹوپی کج تھی، امیر خسرو حضرت خواجہؒ کی زبانِ اقدس سے یہ مصرع سن کر مست ہو گئے، اور فوراً دوسرا مصرع یہ کہا:-

من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہے،

اور یہ واقعہ ہے کہ خسرو نے اپنے کج کلاہ مرشد ہی کی وجہ سے اپنے قبلہ کو راست کر دکھایا،

سفینۃ الاولیا (ص ۱۷۰) میں ہے کہ ایک بار امیر خسروؒ دہلی سے باہر گئے ہوئے تھے، واپس ہوئے تو ان کے پاس پانچ لاکھ نقرئی ٹنکے تھے، جو ان کے شاہی آقا نے ان کو ایک قصیدہ کے صلہ میں عطا کیا تھا، دہلی کے قریب پہونچے تو ایک فقیر کو اپنے پاس آتے دیکھا جو حضرت خواجہؒ کی خانقاہ سے آرہا تھا، اس کو انھوں نے اپنی جوتیاں دے کر رخصت کیا تھا، امیر خسرو اس کے نزدیک آئے تو بے اختیار ہو کر اس سے مخاطب ہوئے کہ تم سے میرے پیر روشن ضمیر کی خوشبو آرہی ہے، کیا تمھارے پاس ان کی کوئی نشانی تو نہیں؟ فقیر نے وہ جوتیاں دکھائیں، امیر خسروؒ دیکھ کر بیتاب ہوگئے، فقیر سے پوچھا کہ اسے فروخت کرتے ہو؟ وہ راضی ہوگیا تو انھوں نے پانچ لاکھ ٹنکے اس کو دے کر اپنے مرشد کی جوتیاں خرید لیں، ان کو اپنے سر پر رکھ کر مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اس درویش نے اتنے ہی پر اکتفا کیا، اگر اس کے بدلے تمام جان و مال طلب کرتا تو میں حاضر کر دیتا۔

یہ روایت تو بہت مشہور ہے کہ حضرت خواجہؒ کے محبوب بھانجے مولانا تقی الدین نوح کا عین شباب میں انتقال ہوگیا تو ان کو اس سے بڑا صدمہ پہونچا، چھ مہینے تک ان پر مہر سکوت لگی رہی، اس سے امیر خسروؒ بھی مغموم رہتے تھے، ان کو فکر ہوئی کہ کس طرح مرشد کا غم غلط ہو، ایک روز بسنت کا میلہ تھا، ہندو دہلی میں کالکاجی کے مندر پر سرسوں کے پھول چڑھا رہے تھے اور مست ہوکر ترانے الاپ رہے تھے، امیر خسروؒ اس کو دیکھ کر بیخود ہوگئے، فارسی اور ہندی کے چند اشعار اسی وقت موزوں کئے، سرسوں کے پھول توڑے، پگڑی کو کج کرکے مستانہ شان پیدا کی اور جھومتے جھامتے، اشعار پڑھتے حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے جو اس وقت اپنے بھانجے کے مزار پر تھے، امیر خسرو کی مستانہ ادا دیکھ کر اور ان کے اشعار سن کر تبسم فرمایا تو امیر خسروؒ کا کام بن گیا، اس روز سے جب ہندو کالکاجی کے مندر پر جاتے تو دہلی اور قرب و جوار کے صوفیہ قوالوں کو لے کر سرسوں کے پھول ہاتھ میں لئے اشعار پڑھواتے ہوئے مولانا تقی الدینؒ کے مرقد پر جاتے ہیں اور وہاں سے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر آتے ہیں، ان اشعار میں ایک شعر یہ ہے:

اشک ریز آمدست ابر بہار   ساقیا گل بریز و بادہ بیار

قوال ہندی کی ایک ٹھمری کو پڑھ کر بار بار دہراتے ہیں، جس کا ایک مصرع یہ ہے:

ع عرب یار توری بسنت منائی

رفتہ رفتہ دہلی کی درگاہوں میں پندرہ (۱۵) دن تک بسنت کا میلہ رہنے لگا اور دوسری جگہوں میں بھی مسلمان بسنت منانے لگے اور اب بھی یہ منایا جاتا ہے۔

مولانا شبلیؒ نے شعر العجم کی دوسری جلد (ص ۱۲۸) میں رقمطراز ہیں کہ خواجہ صاحب سے امیر کی ارادت اور عقیدت عشق کے درجہ تک پہونچ گئی تھی، ہر وقت ساتھ ساتھ رہتے تھے اور گویا ان کا جمال دیکھ کر جیتے تھے، خواجہ صاحب کو بھی ان کے ساتھ یہ تعلق تھا کہ فرمایا کرتے تھے کہ جب قیامت میں سوال ہوگا کہ نظام الدین کیا لایا ہے تو خسرو کو پیش کر دوں گا، دعا مانگتے تھے تو خسرو کی طرف اشارہ کرکے فرماتے تھے: "الٰہی بہ سوز سینۂ ایں ترک مرا ببخش"۔

اوپر کی تفصیلات سے ظاہر ہوگا کہ حضرت خواجہؒ اور امیر خسروؒ ایک دوسرے کے حبیب و محبوب بنے رہے، مگر ان کے عارفانہ رشتے کے سلسلہ میں کچھ سوالات پیدا ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ جب حضرت خواجہ خود سلاطین وقت سے ملنے اور دربار میں جانا کسی حال میں بھی پسند نہیں کرتے تھے تو اپنے محبوب امیر خسروؒ کو دربار سے وابستہ رہنا کیوں گوارا کر رکھا تھا؟ اس کا جواب تو یہ ہے کہ دربار کی وابستگی سے شریعت کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہوتی تھی، سلاطین وقت سے ملنے پر چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں نے کوئی قدغن بھی عائد نہیں کر رکھا تھا۔

سیر الاولیا جیسے مستند تذکرہ کی روایت ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے پاس اجمیر کے نزدیک ایک گاؤں تھا، وہاں کے مقطع نے ان کے لڑکوں کو تنگ کیا تو لڑکوں کے کہنے پر وہ

بادشاہ سے ملنے کے لئے اجمیر سے دہلی گئے، جہاں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے ساتھ مقیم ہوئے، خواجہ بختیار کاکیؒ خود سلطان شمس الدین سے ملے، جس کو صورت حال معلوم کر کے تعجب ہوا، وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے ملا اور ان کے لئے فرمان لکھ دیا، (ص ۵۳) پھر اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ سلطان شمس الدین التمش حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل نہ تھا، سلطان علاؤ الدین خلجی کے شہزادے خضر خان اور شادی خان خود حضرت خواجہ نظام الدینؒ کی خانقاہ میں تربیت پاتے رہے (سیر العارفین ص ۴۷) حضرت خواجہ کا سلاطین دہلی سے نہ ملنا کسی شرعی قباحت کی بنا پر نہ تھا بلکہ یہ محض ان کے ذاتی کردار کا ایک پہلو تھا، اس لئے دربار سے امیر خسرو کا وابستہ رہنا کوئی ایسی قابل اعتراض بات نہ تھی جس کو حضرت خواجہؒ گوارا نہ کرنا چاہئے تھا۔

حضرت خواجہ چنگ، رباب اور دوسرے مزامیر کے استعمال کو ناجائز سمجھتے تھے، ان سے کہا گیا کہ بعض خانقاہوں میں درویش چنگ، رباب اور مزامیر کی محفل سماع میں رقص کرتے ہیں، تو انھوں نے فرمایا کہ وہ اچھا نہیں کرتے کیونکہ جو فعل نامشروع ہے وہ ناپسندیدہ ہے، ایک مرید نے عرض کیا کہ یہ درویش جب محفل سے باہر آتے ہیں اور ان سے کہا جاتا ہے کہ ایسی محفل میں کیوں شریک ہوئے جہاں مزامیر تھے اور وہاں کیوں رقص کیا، تو جواب دیتے ہیں کہ ہم سماع میں اس قدر مستغرق ہو جاتے ہیں کہ ہم کو خبر نہیں ہوتی کہ اس جگہ مزامیر بھی ہیں، حضرت خواجہ نے فرمایا کہ یہ جواب درست نہیں، اور یہ تمام باتیں معصیت کی ہیں (فوائد الفواد ص ۲۲۷) امیر خسرو کی زندگی تو چنگ و رباب اور مزامیر ہی میں گذری، ان کے دوست مولانا ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں:

"وہ گانے اور راگ وغیرہ ایجاد کرنے کے فن میں کمال رکھتے تھے، موزوں اور لطف طبیعت سے جس فن کو بھی نسبت ہے اس میں ان کو اللہ تعالیٰ نے سرآمد روزگار پیدا کیا تھا، ان کا وجود عدیم المثال تھا" (ص ۳۵۹)

امیر خسرو کے پیر بھائی سیر الاولیاء کے مصنف نے بھی لکھا ہے:

"در علم موسیقی کمال داشت" (ص ۵۸۸)

امیر خسرو کے ان دونوں معاصروں نے مزامیر کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن خود امیر خسروؒ نے اعجاز خسروی میں فن موسیقی پر بہت کچھ لکھا ہے جس کی مشکل عبارت آرائی کی وجہ سے ان کے اس فن کے کمالات کو سمجھنا آسان نہیں، لیکن اس کے مطالعہ سے یہ پتہ چلے گا کہ انھوں نے اس زمانہ کے مزامیر میں سے پنجہ رباب، پنجہ چنگ، دست نائی، دست طنبور، دستک قوال، دستان خشی، شہنائی، بابیک شہنائی، بگ، مسکک، دم سرنے، دمدمۂ نے، تیرۂ ہندی، دہل غازی، دہاک زناں، دہل زناں وغیرہ کا ذکر کیا ہے (اعجاز خسروی ص ۲۸۳، حصہ دوم) وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان مزامیر کے فن سے اچھی طرح واقف تھے۔

صحت وعلت مزامیر نیکو دانیم کہ چوں چنگ از سفیدی اندام سرافگندہ ماند و نامے کہ شکش از نفخ اوزار دہد و مسکک کہ از دمش در نالیدن آید و نوائے کہ تنگی نفس گلوگیرش کند دکوفتگی دف کہ از حرارت مدقوق گردد (ایضاً ص ۲۸۶)

ان کے بجانے کے فن میں اصلاحات بھی کیں اور کچھ نئی چیزیں بھی دریافت کیں۔

اصلاح ہر یک بچہ طریق باید کرد و گرفتن نبض رباب وزدن رگ بربط چناں بر قانونِ حکمت دریافتہ ایم کہ بیمار را طبیب شفا توانیم شد (ایضاً ص ۲۰۶)

اس سے ظاہر ہے کہ امیر خسرو کو مزامیر سے خاص شغف رہا اور عام روایت تو یہ ہے کہ انھوں نے ستار، طبلہ، ڈھولک وغیرہ کے بجانے میں بہت سے اختراعات کئے۔

اس سلسلہ میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ جب حضرت خواجہ مزامیر کی حلت کے قائل نہ تھے تو اپنے محبوب کو اس سے شغف رکھنے کی اجازت کیوں دی؟ اس کا جواب تو بظاہر یہ ہے کہ وہ مزامیر کو

مکروہ اور حرام ضرور سمجھتے رہے مگر ان کے مریدوں کی مجالس سماع میں اس کا استعمال جاری رہا۔ ان کے بعض محتاط مرید اور خلیفہ مثلاً حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی تو اس سے پرہیز کرتے رہے مگر اور مرید اس سے اجتناب نہ کر سکے۔ امیر خسرو کا شمار مؤخر الذکر مریدوں ہی میں کرنا چاہئے۔ مزامیر کی حلت و حرمت پر بحث اب تک جاری ہے، بعض معتدل لوگوں نے یہ لکھ کر معاملہ کو طے کرنے کی کوشش کی ہے کہ فقہاء کے یہاں یہ حرام ہے، لیکن صوفیائے کرام کے یہاں اس کی اجازت ہے۔

امیر خسرو کو بہت ہی محبوب اور عزیز رکھنے کے باوجود حضرت خواجہ کو کبھی یہ خیال نہیں ہوا کہ امیر خسرو دنیا کو تیاگ کر کے صرف ان کے آستانہ پر سر جھکائے ہوئے ہیں، وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کا تعلق دنیا سے باقی ہے، سیر الاولیاء ہی کی روایت ہے (ص ۵۰۶) کہ ایک بار امیر خسرو مجلس سماع کے رقص میں شامل ہو گئے، انھوں نے رقص میں اپنے ہاتھوں کو اوپر کیا تو سلطان المشائخ نے ان کو اپنے پاس طلب کیا اور فرمایا کہ تم دنیا سے تعلق رکھتے ہو، تم کو رقص کے وقت ہاتھ اوپر نہ کرنا چاہئے۔ امیر خسرو نے اپنے ہاتھ نیچے کر لئے اور مٹھی باندھ کر رقص کرنے لگے، چشتیہ سلسلہ میں رقص کے آداب میں ہے کہ جب وہ رقص میں اپنے پاؤں زمین پر پٹکتے ہیں تو دنیا کو گویا لات مارتے ہیں اور جب رقص میں ہاتھوں کو اوپر کرتے ہیں تو گویا آخرت کے طلبگار ہوتے ہیں، اسی کو اس شعر میں اس طرح ظاہر کیا گیا ہے:

رقص گر ہمی کنی رقص عارفانہ کن — دنیا زیر پائے نہ دست بر آخرت فشاں

سیر الاولیاء ہی کے مصنف کا بیان ہے کہ حضرت خواجہ کے حلقۂ ارادت میں ہر قسم کے لوگ تھے، خوب طبعان عالم بھی، شعرائے بے نظیر بھی، ندیمان دلپذیر بھی اور جوانان لطیفہ گو بھی تھے، ان سب کی تربیت ان کے انداز طبع کے مطابق کرتے اور ان کے ذوق کو بیدار کر کے ان کا گویا ازالہ کرتے رہتے۔

"خوب طبعان عالم از شعرائے بے نظیر و ندیمان دلپذیر و جوانان لطیفہ گوے ہمہ بر آستان حضرت سلطان المشائخ نہادہ بودند و از دولت او ہر کسے باندازہ طبع خویش در ہر قسم کہ می بودند، ذوقہا در سینۂ خود احساس کردند۔"

(ص ۵۱۱)

چشتیہ سلسلہ کے اکابر بزرگ راہِ سلوک میں توبہ، عبادت، زہد، رضا، قناعت، مجاہدہ، مشاہدہ، ذکر، فکر، اصلاح، اخلاص، معرفت، شکر اور محبت پر زیادہ زور دیتے، ان میں جو اعلیٰ ترین مقامات پر پہونچے، وہ کوشش فرماتے کہ ان کی توبہ حضرت آدمؑ کی طرح ہو، عبادت حضرت ادریسؑ کی ہو، زہد حضرت عیسیٰؑ کا ہو، رضا حضرت ایوبؑ کی طرح ہو، قناعت حضرت یعقوبؑ، مجاہدہ حضرت یونسؑ، صدق حضرت یوسفؑ، تفکر حضرت شعیبؑ، اصلاح حضرت داؤدؑ، اخلاص حضرت نوحؑ، معرفت حضرت خضرؑ، شکر حضرت ابراہیمؑ اور محبت حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہو۔

(سیر الاقطاب ص ۱۳۸-۱۳۷)

مگر ظاہر ہے کہ یہ تمام اوصاف ہر رہرو سلوک کے لئے ممکن نہ تھے مگر جوہر شناس بزرگ اپنے مریدوں کی ذاتی اور انفرادی صلاحیتوں کو پیش نظر رکھتے اور ان ہی کے مطابق ان کو تعلیم دیتے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اپنے مریدوں کی تعلیم و تربیت میں بہت سخت تھے، کسی قسم کی رو رعایت نہ کرتے، مگر جو جیسا ہوتا اسی لحاظ سے پیش بھی آتے پہلے ذکر آچکا ہے کہ حضرت خواجہ برہان الدین غریبؒ کی بیعت محض اس لئے فسخ کر دی کہ وہ کمبل کو دو تہ کر کے اس پر بیٹھتے تھے، اس کو ان کی تن پروری اور راحت پسندی پر محمول کیا۔ حضرت جلال الدین اودھیؒ اپنے زہد و ورع، ترک اور تجرید کیلئے مشہور تھے، ان کے ساتھیوں نے ان سے درس و تدریس کی خواہش ظاہر کی، حضرت خواجہ

اس کی اجازت چاہی تو انھوں نے فرمایا کہ وہ کسی اور ہی کام کے ہیں، خواجہ مویدالدین کرہ سلطان علاؤالدین خلجی کی شہزادگی کے زمانہ میں اس کے جاں نثاروں میں تھے، مگر ترک دنیا کرکے حضرت خواجہ کے آستانہ پر جبیں سائی کرنے لگے، علاؤالدین خلجی بادشاہ ہوا تو اس نے حضرت خواجہ کے پاس یہ پیام بھیجا کہ وہ خواجہ مویدالدین کرہ کو رخصت کردیں کہ اس کا کام بٹائیں، حضرت خواجہ نے فرمایا کہ ان کو ایک اور کام در پیش ہے، اسی میں وہ کوشش کر رہے ہیں، جب پیامبر نے حضرت خواجہ سے کہا کہ آپ چاہتے ہیں کہ اپنے جیسا سب کو کرلیں؟ تو حضرت خواجہ نے فرمایا: اپنے جیسا کیا، میں تو اپنے سے بہتر کرنا چاہتا ہوں، خواجہ شمس الدین دھاری شاہی ملازمت میں دیوان کے عہدہ پر مامور تھے، اس کو چھوڑ کر حضرت خواجہ کے مرید ہوگئے، اور ان کے ملفوظات کو جمع کرکے مرتب کیا، ایک دن اپنے مرشد سے عرض کیا کہ اگر حکم ہو تو آنے جانے والوں کے لئے ایک مکان بنوالوں، مرشد نے فرمایا: یہ کام اس کام سے جس کو تم نے چھوڑا ہے کم نہیں (سیرالاولیا؛ اخبار الاخیار ص ۱۰۲-۱۰۱، بزم صوفیہ از خاکسار مقالہ نگار ص ۶۰-۲۵۹) حضرت نصیرالدین چراغ دہلوی جب حضرت خواجہ سے تربیت حاصل کر رہے تھے تو ان ہی کی ہدایت کے بموجب دس دس روز گذر جاتے مگر کچھ نہ کھاتے، جب خواہشات کا غلبہ ہوتا تو لیموں کا عرق پی لیتے، جب ان کی عبادت وریاضت میں یاد الٰہی بڑھی تو خلق اللہ کے ہجوم میں ان کو سکون میسر نہیں ہوتا، اپنی یکسوئی میں خلل پانے لگے، جنگل جاکر عبادت کرنا چاہتے تھے، مگر مرشد سے اس کی اجازت براہ راست مانگنے کی ہمت نہیں ہوئی، امیر خسرو کا سہارا لیا اور ان ہی کو سفارش کرنے کے لئے مرشد کی خدمت میں بھیجا، مگر حکم ملا کہ وہ خلق اللہ کے درمیان ہی میں رہیں اور خلق کی جفاؤں کو برداشت کریں، اس ایثار کا بدلہ ان کو ملے گا، اس سلسلہ میں حضرت خواجہ نے یہ بھی فرمایا کہ مختلف افراد مختلف کاموں کیلئے موزوں ہوتے ہیں اسی لئے میں کسی سے تو یہ کرنے کو کہتا ہوں کہ اپنے آپ کو بھی بند رکھے اور اپنے دروازہ کو بھی

کسی کو یہ ہدایت دیتا ہوں کہ وہ مریدوں کی تعداد بڑھائے اور کسی کو یہ حکم دیتا ہوں کہ خلق اللہ کے درمیان ہی میں رہے، ان کی جفاؤں کو برداشت کرتے ہوئے ان سے حسن سلوک سے پیش آئے یہی مقام انبیاء اور اولیاء کا ہے، (سیرالاولیاء ص ۲۳۸)

حضرت خواجہ نے امیر خسرو کی تربیت ان کی افتادِ طبع اور ان کی سیرت کی فطری خوبیوں کے مطابق کی، وہ خود تو بادشاہوں سے کسی حال میں بھی ملنا پسند نہ کرتے، مگر امیر خسرو کو ان کا ہم جلیس اور ندیم بننے کی اجازت دے رکھی تھی، ان کو اچھی طرح یقین تھا کہ امیر خسرو دربار کی رنگ رلیوں اور سرمستیوں میں شریک رہیں یا وہاں کے نغمہ و سرود سے لطف اندوز ہوں یا ان پر شاہانہ جود وکرم مال و دولت کی بارش کتنی ہی ہو، وہ ہر حال میں اپنے اخلاق و کردار کو بلند رکھیں گے اور اپنی سیرت کو داغدار نہ ہونے دیں گے، حضرت خواجہ نے ان کے متعلق جو رائے قائم کی وہ بالکل صحیح ثابت ہوئی، وہ بادشاہوں کو اپنے قصیدوں سے خوش رکھتے، شاہانہ تقریبات میں شان وشوکت کی تصویر کشی کرکے درباریوں کو بھی محظوظ کرتے، پری رویان ہندی کے رقص کا ذکر کرنے میں اپنے شاعرانہ کمالات بھی دکھاتے، ہندی اور ایرانی راگ راگنیوں کو ملاکر ایک فنکارانہ امتزاج بھی پیدا کر دیا، مگر دربارداری کرکے اپنے مرشد کے پاس پہونچتے تو کچھ اور ہی نظر آتے، حضرت خواجہ کی روحانی تعلیم یہ تھی کہ محبت حق جب قلب کا محض غلاف بنی رہے تو معصیت کا امکان ہے لیکن جب خدا کی محبت قلب کے سویدا میں پہونچ جائے تو معصیت کا امکان نہیں ہوتا، امیر خسرو کے قلب میں اپنے مرشد کی تعلیم کی وجہ سے خدا کی محبت ان کے قلب کے سویدا میں پہونچ چکی تھی اس لئے درباروں کی دنیاداری میں ان کے یہاں معصیت کا امکان ہی نہیں پیدا ہوا، سیرالاولیاء ص ۳۶۸ میں ہے کہ حضرت خواجہ کی تعلیم یہ تھی کہ طہارت کی کئی قسمیں ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ دل کو خیانت وغیرہ کے ظاہر سے پاک رکھا جائے، دوسرے یہ کہ اعضاء کو گناہوں سے پاک رکھا جائے، تیسرے یہ کہ دل کو اخلاق ذمیمہ سے پاک رکھا جائے، امیر خسرو نے ہر حال میں اپنے دل کو اخلاق ذمیمہ سے پاک رکھا اس لئے اپنے

شاہی اور روحانی دونوں آقاؤں کے یہاں محبوب رہے، حضرت خواجہؒ کی تعلیم یہ بھی تھی کہ دنیا میں تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں، ایک تو وہ ہیں جو دنیا کو دوست رکھتے ہیں اور اسی کی یاد اور طلب میں تمام دن مشغول رہتے ہیں، دوسرے وہ ہیں جو دنیا کو دشمن جانتے ہیں، اس کی مذمت کرتے اور اس کی عداوت میں عبادت کرتے رہتے ہیں، تیسرے وہ ہیں جو اس سے نہ محبت نہ عداوت کرتے ہیں اور اس کا ذکر بھی نہ محبت اور عداوت سے کرتے رہتے ہیں، ایسے لوگ ان دونوں لوگوں سے بہتر ہوتے ہیں (فوائد الفواد ص ۱۳۱) امیر خسروؒ تیسرے قسم کے لوگوں میں سے تھے، وہ محض ایک زاویہ نشین صوفی ہو جاتے تو حضرت خواجہ کے حلقہ میں ایسے صوفیوں کی کوئی کمی نہ تھی، ان کی زندگی کے کمالات کا راز تو اس میں ہے کہ لسان حال اور لسان قال بن کر جام شریعت اور سندان عشق دونوں کو اپنے ہاتھوں میں لئے خاتمہ بالخیر کو پہونچے، حضرت خواجہ کی تعلیم تھی کہ انسان کے پاس نفس بھی ہے اور قلب بھی، نفس سے غوغا اور فتنہ پیدا ہوتا ہے، قلب کے ذریعہ سے سکون، رضا اور ملاطفت حاصل ہوتی ہے، نفس قلب کے ذریعہ سے مغلوب ہو سکتا ہے، لیکن نفس کو نفس سے سہارا مل جائے تو فتنہ اور خصو کی کوئی حد نہیں ہوتی، اس لئے تحمل اور حلم اس درجہ کا ہونا چاہئے کہ

زہر بادی چو کاہی گر میرزی   اگر کوہے بکاہی ہم نیرزی
(فوائد الفواد ص ۱۳۲)

امیر خسروؒ کی زندگی اس کا مظہر ہے کہ اپنے نفس کو اپنے قلب پر غالب نہیں ہونے دیا جس سے ان کے قلب کو ایسا سکون حاصل ہوتا رہا کہ وہ اپنے روحانی آقا کی رضا اور شاہی آقا کی ملاطفت کے سایہ میں زندگی گذارتے رہے، وہ اگر اپنے روحانی آقا کی ہر نفس سے پر کاہ کی طرح لرزتے رہے تو انھوں نے اپنے شاہی آقا کی شان و شوکت کے پہاڑ کے سامنے جھک کر اپنے دین و ایمان کی بازی بھی لگانا پسند نہیں کیا، جس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ سلطان جلال الدین خلجی کو حضرت خواجہ سے ملنے کی بڑی تمنا تھی، مگر حضرت خواجہ سلطان وقت سے ملنا کسی حال میں بھی پسند نہیں کرتے تھے، اس لئے سلطان نے بھیس بدل کر امیر خسروؒ کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا، امیر خسروؒ سے سلطان نے اس کو

راز میں رکھنے کی فہمایش کی۔ امیر خسروؒ کے دل میں یہ خیال آیا کہ راز افشا ہونے کے بعد کہیں ان کے مرشد کو گرانی اور ناگواری نہ ہو، اس لئے سلطان کی فہمایش کے باوجود اپنے مرشد کو اپنے شاہی کا ارادہ بتا دیا جس کے بعد حضرت خواجہؒ شہر چھوڑ کر اپنے مرشد کی زیارت کے لئے اجودھن روانہ ہو گئے۔ سلطان کو خبر ہوئی تو امیر خسروؒ سے باز پرس کی کہ یہ راز کیوں فاش کیا، امیر خسروؒ نے ایمانی قوت سے سلطان کو یہ جواب دیا کہ اگر آپ رنجیدہ ہوتے تو زیادہ سے زیادہ میری جان کا خطرہ ہے، لیکن مرشد آزردہ ہوتے تو میرے ایمان کا خطرہ تھا۔ سلطان کو یہ جواب بہت پسند آیا۔ (سیر الاولیا ص ۱۳۵)

امیر خسروؒ کی روحانی زندگی کا راز اسی میں ہے کہ ہر حال میں اپنے ایمان کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھا۔

امیر خسروؒ کو اپنے مرشد سے باطنی تعلیمات کے ساتھ ظاہری تعلیمات بھی برابر حاصل ہوتی رہیں، پہلے ذکر آیا ہے کہ وہ اپنے مرشد کی ہدایت کے مطابق روزانہ تہجد کے وقت کلام پاک کے سات پارے پڑھتے، (سیر الاولیا ص ۳۰۲)

پھر ان کو یہ بھی تلقین کی کہ وہ مشائخ کی باتوں کا لحاظ رکھیں۔ (ایضاً ص ۳۰۴) حضرت خواجہؒ کی یہ تعلیم تھی کہ عبادت کی دو قسمیں ہیں، لازمہ اور متعدیہ، عبادت لازمہ میں نماز، روزہ، حج، اوراد اور تسبیحات داخل ہیں، جن سے عبادت کرنے والوں کو فائدہ پہونچتا ہے، عبادت متعدیہ کا فائدہ غیروں کو پہونچتا ہے، عبادت لازمہ میں اخلاص کا ہونا ضروری ہے تاکہ یہ خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول طاعت عبادت متعدیہ میں اخلاص جہاں تک بس میں ہو اختیار کیا جائے۔ (فوائد الفواد ص ۳۱)

امیر خسروؒ اپنے مرشد کی اس تعلیم پر بھی برابر عمل کرتے رہے، جیسا کہ ان کے دوست مولانا ضیاء الدین برنی کا بیان ہے کہ ان کی عمر کا بیشتر حصہ صوم و صلوٰۃ، عبادت اور قرآن خوانی میں گذرا، وہ متعدی اور لازمی عبادات میں یکتا تھے اور ہمیشہ روزے رکھتے تھے۔ (تاریخ فیروز شاہی ص ۳۵۹)

سیر الاولیا کے مصنف کا بیان ہے کہ حضرت خواجہؒ اپنے دست خاص سے خطوط لکھ کر کچھ نہ کچھ تعلیم دیتے رہتے، ایک میں نصیحت کی کہ جسم کی حفاظت کے بعد شریعت کی ناپسندیدہ باتوں سے اجتناب کیا جائے اپنے اوقات کی نگہبانی کرتے رہنا چاہئے، عمر عزیز کے ذریعہ سے تمام مرادیں حاصل ہوتی رہیں تو اس کو غنیمت سمجھا جائے، زندگی بیکار کاموں میں نہ گذاری جائے، اگر دل میں انشراح کی قوت پیدا نہ ہو تو انشراح قلبی کی پیروی کی جائے، کیونکہ یہی راہِ طریقت میں معتبر ہے اور تمام امور میں طلبِ خیر کو مقدم رکھا جائے۔

(سیر الاولیا ص ۳۸۵، ۳۸۷۔ اخبار الاخیار ص ۹۳)

اس بات کی کون تردید کر سکتا ہے کہ امیر خسروؒ کی زندگی اس نصیحت کے مطابق نہیں رہی، وہ جسمانی گناہوں سے محفوظ رہے، دربار کی رنگ رلیاں اور سرمستیاں شریعت کی ناپسندیدہ باتوں میں ضرور تھیں مگر وہ ان کے دور کے محض تماشائی تھے۔ ان میں کبھی ملوث نہیں ہوئے، اپنے اوقات کی پوری نگہبانی کی، چاہے وہ اپنے مرشد کے حضور میں ہوتے یا دربار شاہی میں حاضر رہتے، ان کی عمر عزیز میں ہر قسم کی مرادیں حاصل ہوتی رہیں، ان کو وہ غنیمت اس لحاظ سے سمجھتے رہے کہ اگر یہ مرادیں دولت کی شکل میں ہوتیں تو ان کو اپنے خاندان، اعزہ، اقربا، غربا اور مرشد کی خانقاہ میں صرف کر دیتے؛ اسی لئے انھوں نے اپنے پیچھے کوئی بڑی دولت نہیں چھوڑی، وہ چاہتے تو امیر کبیر بن سکتے تھے، لیکن درویشانہ زندگی ہی بسر کی، انھوں نے درباداری ضرور کی لیکن اس کو ان کی زندگی کے بیکار کاموں میں شمار نہیں کیا جا سکتا ہے، درباداری کے سلسلہ میں انھوں نے جو قصائد کہے، یا مثنویاں لکھیں وہ شعر وادب کے شاہکار ہیں، بقول مولانا ضیاء الدین برنی انھوں نے اپنے پیچھے علم وفن کا ایک کتب خانہ چھوڑا، اگر وہ دربار سے وابستہ نہ ہوتے تو یہ کتب خانہ ان کی بعد کی نسلوں کو حاصل نہ ہوتا، آخر میں مذکورہ بالا تحریر میں حضرت خواجہؒ نے جو یہ نصیحت کی تھی کہ انشراح قلبی

کی پیروی کی جائے تو امیر خسرو اپنی نجی، روحانی، ادبی اور درباری زندگی میں اسی انشراح قلبی کے پیکر تھے اور تمام امور میں طلب خیر کو مقدم رکھتے۔

امیر خسروؒ کی وفات جس انداز میں ہوئی وہ بھی ان کے مرشد سے عشق کے انتہائی کمال کا ثبوت ہے، بقول مولانا شبلی خسرو اپنے مرشد کا جمال دیکھ کر جیتے رہے، جب ان کے مرشد کی وفات ہوئی تو خود ان کی بھی موت آگئی، وہ اپنے مرشد کی وفات کے وقت دہلی سے دور سلطان محمد تغلق کے ساتھ بنگالہ کی مہم پر تھے، وہاں یکایک ان کے دل پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی، سلطان سے اجازت لے کر چل کھڑے ہوئے، دہلی پہونچ کر معلوم ہوا کہ محبوب الٰہی اپنے محبوب سے جا ملے، یہ سن کر بے تاب ہوگئے، اپنا منھ سیاہ کیا، کپڑے پھاڑ ڈالے، خاک میں لت پت حجرہ میں پہونچے

جامہ دراں چشم چکاں خون دل رواں

بولے اے مسلمان میں کون ہوں کہ ایسے بادشاہ کے لئے روؤں، میں تو اپنے لئے روتا ہوں کہ سلطان المشائخ کے بعد میری زندگی کی بقا زیادہ نہیں، اس کے بعد چھ مہینے اور زندہ رہے پھر اپنے محبوب سے جا ملے، سلطان المشائخ کے روضہ کے پاس ہی دفن ہوئے۔

(سیر الاولیا ص ۳۰۵)

سیر الاولیا میں تو نہیں مگر اور تذکروں میں یہ روایت بھی ہے کہ دہلی پہنچ کر جب ان کو اپنے مرشد کی وفات کی خبر ملی تو اپنی ساری ملکیت مرشد کے ایصال ثواب کے لئے فقیروں اور مسکینوں میں لٹادی، ماتمی لباس پہن کر مرشد کے مزار پر پہونچے، اس سے ٹکرا کر ایک چیخ ماری کہ سبحان اللہ آفتاب تو زمین کے اندر ہے اور خسرو ابھی زندہ ہے، پھر یہ ہندی شعر پڑھا:

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس   چل خسرو گھر آپنے رین بھئی کہوں دیس

یہ پڑھ کر بے ہوش ہوگئے اور اسی اندوہ وغم میں چھ مہینے کے بعد عالم بقا کو سدھارے۔

(سفینۃ الاولیاء ص ۷۰، خسرو کی ہندی کویتا، بنارس ایڈیشن ص ۴۴، وحید مرزا)

سیرالاولیا کے مصنف ہی کا بیان ہے کہ امیر خسرو نے اپنے مرشد کی وفات پر ایک مرثیہ بھی لکھا تھا،
جس میں وفات کی یہ تاریخ کہی :

ربیع دوم و ہزدہ زمہ در ابر رفت آں مہ
زمانہ چو شمار بیست داد و پنج و ہفصد را

(سیرالاولیا ۱۵۵)

یہ بات ذہن میں ضرور آنی چاہئے کہ اگر امیر خسرو مستقیم الحال صوفی تھے تو تصوف میں اپنے پیچھے کون سا سرمایہ چھوڑا ۔ اس راقم کا جواب یہ ہے کہ افضل الفوائد اور اپنی شاعری ۔

یہ کہنے میں بالکل تامل نہیں کہ امیر خسرو پر اب تک ڈاکٹر وحید مرزا سے زیادہ کوئی اور محقق مستند قرار نہیں دیا گیا ہے ۔ وہ افضل الفوائد کو امیر خسرو کی زندگی کا پھل بتا کر لکھتے ہیں :

یہ کتاب بظاہر میر حسن کی عظیم تصنیف فوائد الفواد کی تقلید میں لکھی گئی، اس لئے یہ اعجاز خسروی یا خزائن الفتوح سے بالکل مختلف ہے ، اس کی زبان بہت ہی سادہ ، سلیس اور لفظی صنائع سے بالکل پاک ہے ، اس زمانہ میں جو فارسی زبان بولی جاتی تھی ، یہ اس کا عمدہ نمونہ ہے ۔

(ص ۲۲۵)

مگر کچھ ایسے محققین بھی ہیں جو اس خیال کے ہیں کہ افضل الفوائد کو امیر خسرو نے خود مرتب نہیں کیا بلکہ ان کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے ، اس پر برابر بحث جاری ہے ، اس میں کتابت کی بہت سی غلطیاں ملیں گی، سنین و اسماء کے ذکر اور واقعات کی ترتیب میں بھی خامیاں ہیں، لیکن اگر مختلف نسخوں کو سامنے رکھ کر اس کو محنت سے ایڈٹ کیا جائے تو اس کے متعلق بہت سے شکوک و شبہات دور ہو سکتے ہیں جیسا کہ آئندہ بحث سے ظاہر ہوگا ۔

(باقی)

مولانا شاہ بدرالدینؒ

از

جناب مولوی محمد عاصم صاحب قادری ندوی

(۳)

ذوق طاعت و مجاہدہ کسب سلوک ، عبادت و ریاضت ، طاعت و مجاہدہ کا ذوق موروثی تھا ، آپ کے والد ماجد حضرت مولانا شاہ شرف الدین اپنی "یادداشت" میں تحریر فرماتے ہیں کہ :

"در عمر ہفت سالگی بحمداللہ از ضروری مسائل وضوو نماز واقف گردید ، نماز برخود لازم گرفت و بہر پنج وقت در جماعت شریک می شود "

جب آپ نے مشق سلوک شروع کی تو آپ کی حرارت ذکر و فکر سے خانقاہ کا ماحول منور ہو گیا ، اس تاثیر کو ارباب ادراک نے نمایاں طور پر محسوس کیا ، حالانکہ اس وقت آپ کی عمر زیادہ نہ تھی ۔

مولوی شاہ محمد یحیٰی نے ایک بار فرمایا کہ میں آج کل خانقاہ میں ایسی روحانی تاثیر محسوس کر رہا ہوں جیسی شیخ العالمین شاہ نعمت اللہ کے زمانہ میں تھی ۔

اس طبعی رجحان اور تسلسل اذکار کی وجہ سے معارف و اسرار اور احوال و مقامات سے بہت جلد آشنا ہو گئے ، آپ خود فرمایا کرتے تھے کہ میں نے جب اذکار کی مشق شروع کی تو پیر و مرشد نے حضرت رسول نما کے ملفوظات کا درس شروع کر دیا ، اس کے فوائد بہت جلد شروع ہو گئے ، مجھے حیرت ہوئی کہ اس قدر جلد فوائد کا پیدا ہونا ہماری حیثیت سے بالاتر ہے ، جو کچھ بھی میں محسوس کر رہا ہوں وہ ہمارے پیر و مرشد کی

قوت تصرف ہے، اس وقت میری عمر سترہ اٹھارہ برس کی تھی اور ملفوظات کے مضامین تمام تر حالات وواردات پر مشتمل ہیں، جس کی تفہیم ان ہی لوگوں کو ہو سکتی تھی جن پر اذکار و اشغال کی مشق کے بعد یہ حالات گذرتے یا گذر چکے ہوں مگر الحمد للہ ہمارے پیر و مرشد کی قوت تفہیم اور زور تصرف کہ مجھے ان مضامین کے سمجھنے میں کبھی الجھن نہ پیدا ہوئی، جیسے آئینہ کے اندر صورت نمایاں ہو جاتی ہے، اسی طرح اس کا مطلب ہم پر منکشف کر دیا جاتا تھا۔

سات برس کے مجاہدہ و ریاضت کے بعد ۱۲۸۹ھ میں آپ کے عم محترم نے خرقہ پوشی کی، یہ محض رسم نہ تھی، بلکہ تمام مقامات سلوک طے کر کے آپ عرفان کی اعلیٰ منزلوں تک پہونچ چکے تھے، حضرت نصر قدس سرہٗ کے جملہ مسترشدین اور خلفاو نیز دیگر مشائخ ہند آپ کی عظمت کے معترف تھے ہی، چالیس برس کی عمر میں جب آپ نے سفر حج فرمایا تو شیوخ حرمین شریفین نے بھی آپ کے عرفانی مرتبہ کا اعتراف کیا، ان سے افاضہ اور استفاضہ کے تعلقات ہوئے، وہاں آپ جس ذوق و شوق اور لذت و کیف کے ساتھ مجاہدات میں مشغول ہوئے، احاطۂ بیان سے باہر ہے۔

نقش ہے سنگ آستاں پہ ترے داستاں اپنی جبہہ سائی کی

روحانی رفعت اور باطنی فیوض و برکات کے لحاظ سے یہ مقدس سفر آپ کی مبارک سیرت کا نمایاں ترین باب ہے، حج و زیارت کے علاوہ مشاہیر علماء و مشائخ سے ملاقات ہوئی، شیخ عبد الرحمٰن ابو حضیر مدنی اور شیخ عبد اللہ سناری سے حدیث مسلسل بالاولیۃ کی اجازت حاصل کی اور طریقۂ شاذلیہ احمد بدویہ کے اذکار و اشغال کی اجازت ان طریقوں کے نامور مشائخ سے حاصل کی اور اپنے طریقۂ قادریہ کی اجازت ان کو دی، شیخ الدلائل شیخ عبد الحق مہاجر قدس سرہٗ سے دلائل الخیرات، حزب البحر اور اولیات محمد سنبل کی سند حاصل کی، اس وقت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی بھی حیات تھے، ان سے بھی ملاقات کی اور اجازت حاصل کی، اس اجازت نامہ میں حضرت حاجی صاحب نے آپ کے بارہ میں بڑے

بلند الفاظ میں آپ کا ذکر کیا ہے، اجازت نامہ کی عبارت طویل ہے، اس کے چند الفاظ ملاحظہ ہوں:

المقبول بین السمٰوات والارضین	آسمان و زمین کے درمیان مقبول (جناب شاہ)
اللوذعی الالمعی بدر الدین متع اللہ بہ	بدرالدین، اللہ مسلمانوں کو ان سے مستفید کرے،
المسلمین ظہر انوار الذکر علی ظاہرہ وسریٰ	ان مشائخ میں سے ہیں، جن کا ظاہر و باطن (دونوں)
اثرہ فی باطنہ بل تشرف بالفناء	تجلیات ذکر الٰہی سے منور ہے۔ آپ فنا و بقا کے
والبقاء [1]۔	اعلیٰ ترین مقامات سے بھی مشرف ہو چکے ہیں۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے لطف کا سلسلہ صرف اجازت ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ غایت تکریم کے ساتھ پیش آئے اور رخصت کے وقت بہت دور تک مشایعت کی اور جب تک آپ مقیم رہے، حد درجہ قرب و اختصاص کے ساتھ پیش آتے رہے۔

دعاء حزب البحر کا فیضان آپ کی ذات سے اتنا عام ہوا کہ بیشمار حضرات نے اس کی اجازت آپ سے حاصل کی، آپ کے آستانہ پر نصاب و اعتکاف کے لئے طالبین کا ایک ہجوم رہتا تھا، اپنی وفات سے چند روز پہلے حضرت مولانا سید محمد فاخر صاحب (دائرہ شاہ اجمل، الہ آباد) کو ان کی طلب پر آپ نے اجازت مرحمت فرمائی، شاہ صاحب موصوف کے نام اپنے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"احقر کو حضرت عارف باللہ الحاج شاہ امداد اللہ قدس سرہٗ نے جس طرح اس دعاء حزب البحر کی اجازت دی ہے، میں نے آپ کو اور آپ کے دونوں فرزندان حافظ سید شاہد اور حافظ سید قدسی سلمہما اللہ تعالیٰ کو اجازت دی، اللہ تعالیٰ اس کے برکات سے متمتع فرمائے۔"

آپ کے سلاسل روحانی کی فہرست طویل ہے، ان چند سلاسل کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا جو آپ کو شیوخ حرمین سے پہونچے: سلسلۂ قادریہ بواسطۂ شیوخ شاذلیہ، سلسلۂ چشتیہ صابریہ، سلسلۂ نقشبندیہ

---

[1] ماخوذ از اجازت نامہ حضرت عارف باللہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ، کتب خانہ مجیبیہ، پھلواری شریف، پٹنہ

سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ، سلسلۂ خضریہ، سلسلۂ رفاعیہ، سلسلۂ قشیریہ، سلسلۂ احمد بدویہ، سلسلۂ مدنیہ مغربیہ، سلسلۂ زتیہ، سلسلۂ عیدروسیہ، سلسلۂ شاذلیہ، سلسلۂ قادریہ بواسطہ حضرت علامہ ابو عبداللہ محمد بن سلیمان جزولی مصنف دلائل الخیرات۔

معمولات شب و روز | ارشاد و تلقین، تصنیف و تالیف، عبادت و ریاضت، تدریس اور اشغال و اوراد کے اوقات مقرر تھے اور آپ اپنے تمام معمولات کے ہمیشہ پابند رہے، مشغولیت کے اس تسلسل میں استراحت کا وقت شب و روز میں شاید ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ نہ تھا۔

صبح کی نماز کے بعد سے اشراق تک آپ مشغول رہتے، اس کے بعد اوراد و وظائف سے فارغ ہوکر مختصر ناشتہ کے بعد چائے نوش فرماتے، دس بجے آپ کی خلوت کا دروازہ کھول دیا جاتا اور طالبین وزائرین باریاب ہوتے، اپنی اپنی حاجتیں پیش کرتے اور کامیاب واپس جاتے، کبھی کبھی بعض حضرات سے علمی، عرفانی اور دیگر موضوعات پر بھی نہایت مفید اور پُرمغز گفتگو ہوتی اور یہ سلسلہ دن کے ۱۲ بجے تک جاری رہتا، پھر دن کا کھانا تناول فرماتے اور کتابوں کا مطالعہ فرماتے، کبھی کبھی نیند آجاتی تو تھوڑی دیر قیلولہ فرمالیتے، ظہر کی اذان کے بعد ضروریات سے فارغ ہوکر جماعت کے لئے مسجد میں تشریف لے جاتے، سات برس کی عمر سے اخیر ساعت تک نماز باجماعت کا اہتمام تھا، شاید ہی چند نمازیں تنہا پڑھی ہوں، نماز ظہر کے بعد اپنی خلوت میں تشریف لاتے اور اوراد معمولہ سے فرصت کے بعد ملک کے مختلف گوشوں سے آئے ہوئے خطوط کے جوابات اپنے دست مبارک سے تحریر فرماتے، پھر عصر کی اذان کے بعد جماعت کے لئے مسجد تشریف لاتے، نماز کے بعد اکابر کے مزار پر فاتحہ کے لئے جاتے، واپسی میں مسجد کے سائبان میں ایک خاص اور معین مقام پر تشریف فرما ہوتے، نماز عصر کے بعد کے معمولات ادا فرمانے کے بعد لوگ اگر کچھ پوچھتے توان کو جواب سے سرفراز فرماتے، اس وقت کی مجلس بھی نہایت بابرکت اور پُراز معلومات ہوتی، نماز مغرب کے بعد مسجد ہی میں عشاء تک آپ مشغول رہتے، عشاء کی نماز کے بعد خلوت میں تشریف لیجاتے، تھوڑی دیر کیلئے

اس وقت بھی خلوت کھول دی جاتی، لوگ باریاب ہوتے، مختصر وقفہ کے بعد خلوت بند کردی جاتی، اس وقت سے آپ کتابوں کے مطالعہ، استفتوں کے جوابات اور زیر تصنیف کتابوں کے لکھنے میں ۱۲ بجے تک مصروف رہتے، پھر بمشکل ایک ڈیڑھ گھنٹہ استراحت فرماکر رات کے ڈیڑھ بجے سے تہجد اور اذکار و اشغال میں صبح تک مصروف رہتے۔ اخبارات اور ماہنامے عموماً دن کا کھانا کھانے کے وقت ملاحظہ فرماتے۔

ایام علالت میں جب ضعف و نقاہت زیادہ ہوگئی تو بعض معمولات بالواسطہ ادا ہوئے، وفات سے چند روز پہلے نقل و حرکت سے بھی معذوری ہوئی تو اپنے خلف اصغر مولانا حافظ شہاب الدین صاحب مدظلہ کو حکم دیا کہ جمعہ کے معمولات قرآنی پڑھ کر سنائیں، چنانچہ انھوں نے سورۂ بقرہ رکوع اول، سورۂ بقرہ رکوع آخر آیۃ الکرسی، سورۂ حدید، سورۂ دخان، سورۂ واقعہ، سورۂ یٰسین، سورۂ جمعہ، سورۂ منافقون، سورۂ کہف، سورۂ مزمل، سورۂ ملک، سورۂ نبأ، سورۂ نازعات، سورۂ اعلیٰ، سورۂ قدر، سورۂ والتین، سورۂ کوثر، سورۂ کافرون، سورۂ اخلاص اور معوذتین کی تلاوت کی۔

وفات سے دو دن پہلے جب غلبۂ نقاہت کی وجہ سے گفتگو محال تھی، اس حالت میں بھی نماز کا اہتمام تھا، حکیم شعیب صاحب کا بیان ہے: ۴۵ منٹ تک جس وقت سے میں حاضر ہوا تھا پھر دیر تک معمولات پڑھتے رہے اس کے بعد زانو بدلا اور لیٹنے کا ارادہ کرکے بیٹھ گئے مگر لیٹے نہیں، میں یہ سمجھ کر کہ شاید آپ لیٹنا چاہتے ہیں، قریب پہونچا، عرض کیا کہ لٹادوں، بے حس و حرکت خموش بیٹھے رہے، مجھے یہ کیفیت دیکھ کر بہت تردد ہوا، میں نے پھر باصرار پوچھا تو آپ کو اس قدر ضعف ہوگیا تھا کہ آپ بول نہیں سکتے تھے بڑی مشکل سے نہایت دھیمی آواز میں فرمایا: ہاں لٹادو۔

درس قرآن اور درس ملفوظات کی مصروفیت بھی وفات سے چند ماہ پہلے تک پورے انہماک کے ساتھ جاری رہی، ۱۴۲۲ھ کے رمضان شریف کی آمد پر آپ کے فرزند گرامی مولانا قمر الدین صاحب نے درخواست کی کہ گذشتہ برسوں کے رمضان شریف میں ملفوظات مولانا کا درس ہوا کرتا تھا، تمنا کہ

ہم لوگوں کو فہرست اذکار مرتبہ حضرت نصیرؔ قدس سرہٗ پڑھادی جائے، وقت مرحمت فرمایا گیا اور
یکم رمضان سے باقاعدہ تدریس شروع ہوئی ۔

شاعری ان مختلف و متنوع مصروفیات کے باوجود آپ سخن سنج بھی تھے، باطنی محسوسات اور واردات
وکیفیات کے وسیلۂ اظہار کی حیثیت سے شاعری کو صوفیہ و مشائخ کی بزم میں جگہ ملتی رہی ہے، اس کی
رمزی وایمائی خصوصیت نے احوال و مقامات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ فکر و نظر کی تربیت و تطہیر بھی
کی ہے، اس لئے خانقاہوں کا ماحول طاعت و مجاہدہ اور فکر و مراقبہ کی وجہ سے جہاں عارفانہ ہوتا ہے
وہاں تجلیات حسن و حقیقت کے ادراک کی وجہ سے شاعرانہ بھی ہوتا ہے ۔

خانقاہ مجیبی کی بھی صدیوں سے یہ روایت رہی ہے کہ اس کے اکثر سجادہ نشین علم و عرفان کے
تبحر کے ساتھ ساتھ ارباب سخن بھی رہے ہیں، حضرت تاج العارفین کے پوتے حضرت فردالاولیاء فردؔ
فارسی شاعری کے مسلم الثبوت استاد تھے، آپ کے کلام کی دو جلدیں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں، خسروؔ و حافظؔ
کی خصوصیات سخن کا امتزاجی نمونہ جس طرح حضرت فردؔ کی شاعری میں ملتا ہے ہندوستان کے کسی فارسی شاعر کے کلام میں نہیں ملتا،
حضرت فردؔ کے علاوہ متعدد صاحب دیوان شعراء ایسے گذرے ہیں جن کی عظمت کا اعتراف
زمانہ نے کیا ہے، حضرت شاہ بدرالدین کے والد ماجد حضرت مولانا شاہ شرف الدین خود صاحب دیوان
شاعر تھے اور آپ کے پیر و مرشد شیخ الاسلام حضرت مولانا شاہ علی حبیب نصرؔ بھی فارسی کے ایک بلند پایہ
شاعر تھے، اس لئے مولانا کو دوسری خصوصیات کی طرح شاعری کا ذوق بھی وراثۃً ملا تھا، علامہ سید سلیمان ندوی
اپنے مذاق سخن کی تربیت کے سلسلہ میں خانقاہ مجیبی کے شاعرانہ ماحول کا اس طرح ذکر فرماتے ہیں :

"یہاں خانقاہ میں ہر ہفتہ قوالی ہوتی تھی، اس کے اثر سے اس قصبہ میں شعر و شاعری کا
خاصا چرچا تھا؛ اسی فضا میں میں نے سانس لی" (۱)

مشاغل کی کثرت کی وجہ سے آپ کو اس جانب توجہ کا موقع نہ ملتا، لیکن کبھی کبھی باطنی تحریک کی

(۱) حیات سلیمان : ص ۸

بنا پر جو کچھ آپ ارشاد فرماتے تھے وہ ایک مختصر مجموعۂ کلام کی صورت میں ہمارے سامنے ہے، اپنے
والد کے خالہ زاد بھائی شاہ وصی احمد مجیبی کو اپنا کلام دکھاتے تھے، علم عروض اور دوسرے نکات فن کی
باقاعدہ تحصیل ان ہی سے کی، آپ فارسی، عربی اور اردو تینوں زبانوں میں اشعار کہتے تھے، اردو کے
اشعار تو دو ہی چار محفوظ رہ گئے ہیں، عربی کی بھی صرف ایک مناجات جو آپ نے راجگیر پہاڑ پر کہی تھی
محفوظ رہ گئی ہے، بقیہ سارا کلام فارسی میں ہے جس میں کچھ نعتیں، چند قطعات تاریخ، بعض قصائد منقبت
اور کچھ غزلیں ہیں ۔

گو آپ کا کلام زیادہ نہیں ہے لیکن جو کچھ ہے وہ سراپا انتخاب ہے، نعتوں میں احوال و مقامات
کی طرف اشارات اور غزلوں میں فارسی شاعری کی دلکش خصوصیات موجود ہیں، عشق حقیقی کا سوز و گداز
حسن کی رنگا رنگ تجلیاں، ذوق و شوق کی وارفتگی، نگاہ و دل کی سرشاری، جذب و کیف کی
بے ساختگی اور برجستگی ہر ہر شعر سے نمایاں ہے، اظہار جذبات میں صداقت کی جلوہ گری نے کلام کو بہت
پُراثر بنا دیا ہے، لب و لہجہ کی پُرکارانہ سادگی اور مترنم الفاظ کی وجہ سے آپ کی غزلوں میں
ایک خاص موسیقیت پیدا ہوگئی ہے ۔

غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

جاں را کمند زلف بہ سوئے تو می کشد   ویں استخوانِ ما سگِ کوئے تو می کشد
امروز بیقراریٔ دل شد فزوں چناں   شوقِ تو بار بار بہ سوئے تو می کشد
از بوئے گل نہ تازہ شود ایں شامِ ما   لیکن بہ باغ نفحۂ بوئے تو می کشد

بہ سودائے زلفِ تو سری فروشم   دل و جاں بہ تیر نظر می فروشم
چوں بے پردہ روزے تجلی نماید   بہ نورِ تجلی نظر می فروشم

درون ہر بن مویم شود بر تن اگر چشمے   نیا سایم ز دیدارت اگر بینم بہ ہر چشمے

بہ دیدار تجلیہائے بوقلمون تو دارم | بہ ہر صبحے دگر چشمے، بہ ہر شامے دگر چشمے
ز گنجِ شادمانیہائے عالم دردِ تُش بہ | کسے کز ہجر تو دارد دلِ پُر درد و تر چشمے
بہ عالم ہر کہ باشد ہر چہ باشد جلوہ آئے تست | توئی ناظر ز ہر دیدہ توئی در پیشِ ہر چشمے

آں جفا پیشہ کہ نقدِ دل و ایماں زد و برد | غارتے بر سرِ ایں بے سر و ساماں زد و برد
نفسے چند کہ می داشت تنِ زارِ مِ بدرؔ | نشترے بر رگِ جانم سرِ مژگاں زد و برد

بیادِ چشمِ تو نرگس بہ باغ حیران ست | فدائے پیچ و خمِ زلف سنبلستان ست
چوں نیست آں گلِ خوبی بہ من دریں گلگشت | بہ چشمِ من ہمگی خارِ ایں گلستان ست
فدائے چہرۂ تابانِ تست بدرؔ حزیں | فدائے کاکلِ تو ہندو و مسلمان ست

آپ کی نعتوں میں بھی یہی وارفتگیٔ شوق، گہری معنویت اور احتیاطِ ہوش و نظر کے ساتھ نمایاں ہے

ز عمرے بس ہمیں دارم تمنّا | کہ بہشت جاں سپارم یا محمدؐ
بہ جز گردیدنِ گردِ سرایت | چہ خیزد از غبارم یا محمدؐ
شفیقے مہربانے غمزدائے | کسے جز تو ندارم یا محمدؐ
ز عکسِ مہرِ رویت بدرؔ گردم | ہمیں امید دارم یا محمدؐ

دو ہر زن سودائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم | در دل و دیدہ جائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
بخت رسا کو تا کہ قدم ساند بہ قدوش یا خدایا | جان و تنم بر پائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم

ز تنہا من تمنائے تو دارم | فدا وصلِ تو خواہان است امشب
بیا بنگر نثارِ مقدمت را | دو چشمم گوہر افشان است امشب

حضرت صدیق اکبرؓ کی شان میں یہ منقبت ملاحظہ ہو۔

محمد شد چو جسم و جانِ صدیقؓ | چہ می جوئی حد و پایانِ صدیق

نہ بینی جز محمد ہیچ در وے | محمد ظاہر و پنہانِ صدیق
ز احسانش بہ عالم کیست خالی | محمد داشت چوں احسانِ صدیق

اپنے پیر و مرشد حضرت نصرؔ قدس سرہٗ کی وفات پر آپ نے جو قطعہ تاریخ فرمایا، اس کے چند اشعار یہ ہیں :

چوں ایں کمتر و کہتریں مریداں | بہ ادراکِ حالش ز دل یافت ایماں
بہ جستم بہ ہر چرخ و ہم عرش و کرسی | بہ عدن جناں ہم بہ فردوسِ اعلیٰ
بہ خلد بریں یافتم با محمدؐ | بہ دیدارِ حق فَازَ فَوزًا عَظِیمًا

۱۲۹۵ھ

علالت

مسلسل اور گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے آرام کے لمحات بہت کم میسر آتے تھے، ہرچند کہ آپ جسمانی طور پر تنومند نہ تھے لیکن عرصہ تک صحت خراب نہیں ہوئی، مگر ۱۳۱۷ھ کے بعد جب عمر پچاس سے متجاوز ہونے لگی تو صحت میں گاہے گاہے اختلال رونما ہونے لگا، مگر آپ مجاہدانہ عزیمت کی بنا پر جاں گسل اور زہرہ گداز مصائب و شدائد کا تحمل اس استقامت کے ساتھ کرتے کہ معمولات میں ادنیٰ تغیر بھی نہ ہوتا، ضبط و تحمل کا یہ حال تھا کہ کبھی اپنی زبان سے جسمانی تکالیف کا اظہار نہ فرماتے۔

ایک مرتبہ رات کے پچھلے حصہ میں آپ کے سینہ میں درد شروع ہوا اور آہستہ آہستہ بڑھتا رہا، مگر آپ نے کسی پر ظاہر نہ فرمایا، صبح کی اذان کے بعد نماز باجماعت کے لئے مسجد تشریف لے گئے، واپس آکر معمولات اور وظائف میں مشغول ہوگئے۔ تکلیف کی شدت سے چہرہ کا رنگ متغیر ہونے لگا، اسی اثنا میں مولوی عبدالغفور صاحب عیسیٰ پوری نے خیریت پوچھی تو ارشاد ہوا کہ سینہ میں کچھ درد ہے، مولوی صاحب نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ درد شدید ہے، چہرۂ مبارک کو کئی رنگ بدلتے دیکھا ہے، فرمایا ہاں درد بہت ہے، سانس لینا دشوار ہے۔

۱۳۲۵ھ میں جناب شاہ محمد حیات صاحب سجادہ نشین حضرت مخدوم الملک بہاری خانقاہ میں

مہمان ہوئے، مشائخ کرام کے یہاں یہ دستور چلا آتا ہے کہ کسی صاحب مکرمت کی آمد پر بطور اعزاز و مدارات مجلس سماع منعقد ہوتی ہے، حضرت کے ایمار پر اس مجلس کا اہتمام ہوا، لیکن آپ کو شدید تپ بھی آرہی تھی نو بج گئے تھے اور آپ شدت تپ کی وجہ سے غشی کی حالت میں تھے لیکن اس کے باوجود تیمم فرمایا اور مسجد تشریف لائے، جماعت کے بعد اخلاقاً مجلس میں تشریف فرما ہوئے، قبی خاں قوال یہ شعر گا رہے تھے

خوش آنکہ بندم در رہت بر ناقہ محمل از وطن

خیزم چوں گرد افتم چوں اشک آیم بسر غلطم بتن

تو حضرت نصر رحمۃ اللہ علیہ کے مسترشدین میں ایک صاحب حالت وجد میں مسجد سے باہر آگئے، سب لوگ کھڑے ہوگئے حضرت بھی اپنی معذوریوں کے باوجود کھڑے ہوگئے، جب قبی خاں اس شعر پر پہونچے:

دارم امید مغفرت از دولت نعمت شما

بایں گنہ بایں عمل بایں خطائے ذوالمنن

تو آپ بائیں طرف جھکے، خدام نے آگے بڑھ کر آپ کے دونوں شانوں کو پکڑ لیا، آپکا نصف جسم مبارک ان کے سینے پر آگیا اور غشی کی کیفیت طاری ہوگئی، پھر دو آدمیوں کے سہارے ہوش آنے کے بعد آپ خلوت میں تشریف لے گئے، ساری رات مزاج متاثر رہا مگر معمولات میں کوئی فرق نہ آیا، اس طرح وقتاً فوقتاً امراض ہوتے رہے، لیکن پھر طبیعت ٹھیک ہو جاتی اور مزاج میں بدستور بشاشت اور تازگی آجاتی، عموماً صحت کے بعد لوگوں کو علم ہوتا کہ طبیعت متاثر ہوگئی یا اس درجہ اضمحلال تھا.

وفات سے کچھ پہلے نزلہ و تبخیر کی شکایت اکثر رہنے لگی تھی، آپ اسپرٹ کی وجہ سے ہومیو پیتھک اور ایلو پیتھک علاج سے احتراز کرتے تھے، اس لئے بایوکیمک دوائیں تیار رکھی جاتیں.

۴ر صفر ۱۳۴۳ھ کو کچھ تبخیری کیفیت شروع ہوئی، ۵ر کو مصروفیت کچھ زیادہ رہی، حزب البحر کے لئے بہ نیت اعتکاف ۲۹ افراد مسجد خانقاہ میں حاضر ہوئے، شام تک آپ سب سے پڑھوا کر

سنتے رہے اور اجازت عطا فرماتے رہے، نماز عصر کے بعد بخار بہت بڑھ گیا، مغرب کے بعد جب مسجد سے باہر تشریف لے جانے لگے تو قدم اٹھانا دشوار تھا، مزاج کی ناسازی تحمل سے باہر ہوگئی، مگر اصرار کے باوجود آپ نے بایوکیمک کے سوا کسی اور دوا کی طرف توجہ نہیں فرمائی اور انتہائی ضعف کے باوجود سارے معمولات ادا فرماتے رہے، ۹ر صفر کو ڈاکٹر ایس پرشاد جب خلوت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے کہا کہ حضور کو ملیریا ہے، لیکن دشواری یہ تھی کہ ان کی مجوزہ دوا ہومیوپیتھک تھی' اسلئے اس اثنا میں یا تو بایوکیمک دوا استعمال فرمائی یا پھر خیساندہ، بخار اور بخار کے ساتھ ضعف بڑھتا گیا اسی درمیان میں کچھ استغراقی کیفیت بھی پیدا ہوئی، پھر صفر کی گیارہ تاریخ آگئی، اس دن زیارت موئے مبارک صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خانقاہ میں اجتماع عظیم ہوتا ہے، صاحب سجادہ آثار شریف کی زیارت کراتے ہیں، مگر یہ پہلا اتفاق تھا کہ آپ اپنی سخت علالت کی وجہ سے تشریف نہ لیجا سکے' آپ کے ایمار پر نیابۃً زیارت اور آثار نمائی کے فرائض آپ کے خلف اکبر مولانا شاہ محی الدینؒ نے انجام دئے، گیارہ کے بعد بخار اور دست و پا کی سوزش اور بڑھ گئی، ۱۲ر صفر کو بخار نہ تھا، خیریت پوچھنے پر فرمایا کہ الحمدللہ طبیعت اچھی ہے، مسواک اہتمام کے ساتھ فرمائی، مولانا شاہ قمرالدینؒ کو طلب فرمایا اور معارف کے تازہ شمارہ کے شذرات پڑھوا کر سنے، پھر جامع صغیر نکلوا کر حاشیہ پر ایک حدیث کے اندراج کا حکم صادر فرمایا، تھوڑی دیر کے بعد کچھ سر گرانی شروع ہوئی، پھر بخار آیا ضعف بڑھ گیا اور نبض غیر منتظم ہوگئی، ۱۳ر صفر کو مولانا شاہ سلیمان پھلواروی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر حضرات کے مشورہ سے پٹنہ سے کچھ اور ڈاکٹر بلوائے گئے، یہ وہ دن تھا جب کہ آپ نے دوا اور پانی بھی قبول کرنے سے انکار فرما دیا تھا، ڈاکٹر صاحبان نے انجکشن دیا، بخار تو کم ہوا مگر استغراقی کیفیت بڑھ گئی اور غایت ضعف کی وجہ سے قوت نے بھی اپنا کام کرنا چھوڑ دیا، ۱۴ر صفر کو بخار جاتا رہا، ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب نے اطمینان ظاہر کیا، مولانا شاہ سلیمان صاحب اور دیگر

حاضرین سے کچھ آپ نے گفتگو بھی فرمائی، تھوڑی دیر کے بعد پھر وہی استغراقی کیفیت ہوگئی اگر کسی کی آواز سنتے تو آنکھیں کھول دیتے، دریافت مزاج پر ارشاد فرماتے: الحمدللہ! پندرہویں شب کو تمام اعزہ و خدام حاضر خدمت رہے اور ختم دلائل الخیرات، باقیات الصالحات وغیرہ کرتے رہے، لیکن اب خود سے آپ کروٹ بدلنے سے بھی معذور ہو گئے تھے، ۱۵ صفر کو اکثر خدام کو یہ یقین ہوگیا کہ یہ استغراق نہیں بلکہ سفر آخرت ہے۔ سورہ یٰسین کی تلاوت شروع کی گئی اور درود شریف، نیز دیگر اوراد شروع کردیے گئے، خلوت کھول دی گئی، تمام مشتاقان زیارت نے شرف دیدار حاصل کیا اور آپ کے خلف اکبر مولانا شاہ محی الدینؒ نے خواہشمندوں کی بیعت نیابۃً لی۔

وفات انجکشن دیا گیا تھا مگر تمام حاضرین اور معالجین اب مایوس ہو چکے تھے، آخر وقت موعود آپہونچا، اور صفر کی سولھویں شب کو سوا سات بجے وفات پائی، دن کو ساڑھے دس بجے نماز جنازہ ہوئی اور آپ کے خلف اکبر مولانا شاہ محی الدینؒ نے پڑھائی، تاج العارفین مخدوم شاہ محمد مجیب اللہ قدس سرہٗ کے مزار سے متصل مدفون ہوئے، آپ کی وفات پر سارے ملک میں رنج و ملال کا اظہار کیا گیا اور اخبارات و رسائل نے تعزیتی مضامین لکھے، ذیل میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کے تاثرات درج کئے جا رہے ہیں، ربیع الاول ۱۳۴۳ھ کے معارف میں لکھتے ہیں:

"ابھی گذشتہ مہینہ کے معارف میں، ہم نے حضرت امیر شریعت صوبۂ بہار اور امارت شرعیہ صوبۂ بہار کا تذکرہ کیا تھا، خیال میں بھی نہ تھا کہ اس کے ایک ہی مہینے کے بعد ہم کو حضرت ممدوح کی دائمی مفارقت کا ماتم کرنا پڑے گا، حضرت مولانا شاہ بدرالدین سجادہ نشین پھلواری اس عہد کے جنید و شبلی تھے، ان کا زہد و ورع، نزاہت و اتقاء، علم و عمل، صورت و سیرت، ہر چیز نمونۂ سلف تھی، کم و بیش چالیس برس تک یہ علم و عرفان کی شمع صوبۂ بہار میں روشن رہی اور اس کی روشنی دور دور تک پھیلتی رہی، ان کے شب و روز کے چوبیس گھنٹے ذکر و فکر اور مطالعۂ کتب کے سوا اور مشاغل میں

کم تر صرف ہوتے تھے، ان کی نشست گاہ ایک کتب خانہ تھی، ان کے چاروں طرف کتابوں کا انبار لگا رہتا تھا اور اس کے بیچ میں یہ زندہ کتب خانہ جلوہ فرما رہتا تھا، اس عہد میں یہی ایک ہستی تھی، جو ظاہر و باطن، علم و معرفت، حقیقت و شریعت کا مجمع البحرین تھی اور جس سے ہزاروں اور لاکھوں علم و معرفت کے پیاسے سیراب ہوتے رہتے تھے، پھلواری کا سجادہ اس بزرگ ذات کی رونق افروزی سے چشمۂ خورشید تھا، افسوس کہ یہ آفتاب اب ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا۔

اولاد آپ کے چار صاحبزادے تھے، جن میں مولانا شاہ محی الدین اور شاہ قمرالدین وفات پاچکے ہیں، اور مولانا شاہ نظام الدین اور شاہ شہاب الدین اس وقت موجود ہیں، آپ کی وفات کے بعد بڑے صاحبزادہ مولانا شاہ محی الدینؒ خانقاہ مجیبیہ کے سجادہ نشین ہوئے اور ان کی وفات کے بعد اب ان کے صاحبزادہ شاہ امان اللہ ان کے جانشین ہیں۔

خلفاء و مجازین آپ کے خلفاء و مجازین کی فہرست طویل ہے، چند بزرگوں کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں، راس المتقین حضرت مولانا شاہ محمد محی الدین قدس سرہٗ خلف و خلیفہ و جانشین، حضرت مولانا شاہ محمد قمرالدین قدس سرہٗ، مجاز جملہ سلاسل و مرویات، حضرت مولانا شاہ محمد نظام الدین صاحب مظلہٗ مجاز جملہ سلاسل و مرویات حضرت مولانا شاہ و حافظ محمد شہاب الدین صاحب مدظلہٗ مجاز جملہ سلاسل و مرویات، مولانا حکیم سید محمد شعیب نیر پھلواروی مجاز جملہ سلاسل و مرویات، مولانا حکیم سید شاہ زہیر حسن صاحب ہلسوی مجاز جملہ سلاسل، خواجہ حسن نظامی مجاز جملہ سلاسل (علامہ شیخ ابو حضیر مدنی شیخ الحدیث حضرت فیاض المسلمین) مجاز طریقہ قادریہ وارثیہ و ذکر قدوسیہ، (مدینہ طیبہ) مولانا سید شاہ عبداللہ قادری مجاز جملہ سلاسل سرینگر، کشمیر، مولانا حکیم ابوالحسن صاحب دیسنوی والد ماجد علامہ سید سلیمان ندوی مجاز جملہ سلاسل۔

تصنیفات و تالیفات بیان المعانی تفسیر اردو ناتمام غیر مطبوعہ، الوسیلہ، رویت ہلال، مطبوعہ نایاب، تذکرۂ انساب خاندان امیر عطاء اللہ قلمی، رد اعتراض عمدۃ المطالب فی انساب آل ابی طالب غیر مطبوعہ، مجموعۂ کلام فارسی مطبوعہ، ان کے علاوہ آپ کے بیش بہا مکاتیب ہیں جو لمعات بدریہ کے نام سے چار حصوں میں شائع ہوئے اور ابھی اسی قدر قلمی شکل میں موجود ہیں،

اقبال بحیثیت غزل گو

از

جناب محمد ہاشم صاحب شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

شاعر یا ادیب انسانوں کی اسی دنیا میں رہتا اور بستا ہے اور زمانہ سے متاثر بھی ہوتا ہے، جس کا اظہار وہ کسی نہ کسی طرح کرتا رہتا ہے، ہر کام کی طرح شاعری کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے، کسی شاعر کے یہاں اس کے مقصد اور فن کو علٰحدہ علٰحدہ کر کے دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے اور کسی کے یہاں نہیں، اقبال ایک ایسے شاعر ہیں جن کے فن کو ان کے مقصد سے جدا کرنا گویا جسم اور روح علٰحدہ علٰحدہ کرنے کا مترادف ہے، وہ مقصد کو مقدم رکھتے ہیں اور شاعری کو اس کے پیش کرنے کا آلہ سمجھتے ہیں، اسی لئے وہ اپنا شمار شاعروں اور غزل گویوں میں نہیں کرتے؛

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرم راز درون میخانہ

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں
کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی

اقبال نظم گو کی حیثیت سے مشہور ہیں، مگر ان کو ایک غزل گو کی حیثیت سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، ان کے پیغام، ان کی فکر، ان کے تصورات، ان کے مقصد اور نقطۂ نظر، ان کے فلسفہ اور ان کی نظم گوئی پر کافی لکھا جا چکا ہے، اگر نہیں لکھا گیا یا بہت ہی کم لکھا گیا ہے تو اقبال کی غزل گوئی پر۔

فارسی اور اردو شعرا نے غزل کو عشق و محبت کے معاملات کے لئے مخصوص کر لیا تھا، غالب نے ان حدود کو توڑا، اس میں نئے نئے مضامین داخل کر کے غزل کے دائرے کو وسیع کیا، اس لحاظ سے اگر غالب کو جدید غزل کا امام کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا، اقبال نے غزل کے دائرے کو اور بھی وسیع

کر دیا ہے، انھوں نے ثابت کر دیا ہے کہ اس میں گل و بلبل، شمع و پروانہ، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد وغیرہ کے حسن و عشق کے قصوں ہی پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا، بلکہ یہی سب چیزیں زندگی کی بڑی سے بڑی علامت بن کر ہمارے سامنے آ سکتی ہیں، اس میں ہر قسم کا مضمون جذب ہو سکتا ہے، یہاں تک کہ خالص علمی اور سائنسی نظریے بھی غزل میں بیان کئے جا سکتے ہیں، غزل کا دامن کائنات ہی کی طرح وسیع ہے اس لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ کائنات کے کسی بھی موضوع کو غزل اپنے اندر سمونے سے قاصر ہو، میر جو غزل کے سب سے بڑے شاعر ہیں، وہ ایک بات یا ایک واقعہ کو غزل میں باندھ دیتے ہیں، اقبال بھی ایک ہی شعر میں ایک پورا افسانہ بیان کر دیتے ہیں۔

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے

اس شعر میں کیا نہیں، ابتدا نہیں، عروج نہیں، خاتمہ نہیں، سب کچھ ہے، پورا افسانہ ہے بس یہی اقبال کا کمال ہے، چاہے وہ مذکورۂ بالا غزل کے شعر کی شکل میں ہو یا نظم کے اس شعر کی طرح؛

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود

ان کی غزلوں میں واقعیت کی آویزش ہے، نئی ذہنیت اور نئے وجدان کے نقوش سے "بال جبریل" اور "ضرب کلیم" کے اوراق بھرے ہوئے ہیں، انھوں نے اپنی شاعری کے ہر دور میں غزلیں کہی ہیں لیکن تغزل کا وہ رچاؤ شروع کی غزلوں میں نہیں ہے جس میں بال جبریل کی ہر غزل ڈوبی ہوئی ہے، تغزل اور شعریت اقبال کے مزاج کی ایک فطری کیفیت ہے، اس لئے تغزل ان کے ابتدائی کلام میں بھی کسی نہ کسی رنگ میں اپنی جھلک دکھائی دیتا ہے، انھوں نے سنجیدگی کے ساتھ غزل کو حدود سے نکال کر لامحدود بنانے کی کوشش کی، غزل کی وسعتوں کو آفاق گیر اور اس کی لطافتوں کو بیکراں بنایا، انھوں نے غزل کو قومیات میں داخل کر کے اس سے نظم کا کام بھی لیا

ان کے اس اجتہادات اردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔

لاہور کے ادبی مشاعروں سے ہی اقبال کی غزل گوئی کا آغاز ہوتا ہے، انھوں نے داغ کو ایک مراسلہ کے ذریعہ اپنا استاد بنا لیا تھا، وہ ان سے اصلاح لیتے تھے، انھوں نے داغ کے انداز میں متعدد غزلیں بھی کہی ہیں، ان پر ابتدا میں امیرؔ و داغؔ کا کافی اثر رہا، ان کی ابتدائی غزلوں کو بنانے، ان کی زبان درست کرنے اور ان میں شوخی پیدا کرنے میں داغ کا بڑا ہاتھ ہے، ان میں داغ کی سلاست، اسلوب کی ندرت اور شوخی پائی جاتی ہے، مثال کے لئے دو غزلوں کے چند مشہور اشعار درج ذیل ہیں:

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی   مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمھارے پیامی نے سب راز کھولا   خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
تأمل تو تھا ان کو آنے میں قاصد   مگر یہ بتا طرز انکار کیا تھی

یا

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں   مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی   بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

یہ یا اسی طرح کی چند اور غزلیں سہل ممتنع کی اچھی مثالیں ہیں، ان میں جذبات کی سادگی، بیان کی شوخی اور اظہار کے تیکھے پن میں داغ کا اثر نمایاں ہے، اسی وجہ سے اقبال کے یہاں غزل اپنے روایتی رنگ میں بھی ملتی ہے، وہی حسن و عشق، تصوف و اخلاق کے موضوعات، وہی روایتی مضامین یعنی وعدۂ محبوب، واعظ پر طنز کے نشتر، برق و خرمن کی چشمک، موسیٰ، طور، لیلیٰ اور مجنوں کی تلمیحیں، دنیا کی بے ثباتی، عاشق مہجور کا الم، سبھی کچھ ان کے یہاں بھی ملتا ہے:

واعظ ثبوت لائے جو مے کے جواز میں   اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں   لرز جاتا ہے آوازِ اذاں سے
مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں   تو میرا شوق دیکھ مرا انتظار دیکھ
خبر اقبال کی لائی ہے گلستاں سے نسیم   نو گرفتار پھڑکتا ہے تہِ دام ابھی

غزل میں تصوف کی روایت شروع سے ہی بہت اہم رہی ہے، یہ روایت بھی اقبال کے یہاں ملتی ہے، اس کے ساتھ عقل و ہوش کی معرکہ آرائی ان کی شاعری کا اہم جزو ہے جو بعد کی شاعری میں تندتر ہوگئی ہے، ان کا کلام ایک صوفی شاعر کا کلام نہ ہوتے ہوئے بھی تصوف کی کیفیت اور سرشاری سے لبریز ہے، کہا جاتا ہے کہ اقبال تصوف کے مخالف تھے، یہ صحیح نہیں ہے، وہ اس تصوف کے خلاف تھے جسے انھوں نے غیر اسلامی تصوف سے تعبیر کیا ہے، اس کی وضاحت ان کے ایک خط سے ہوتی ہے:

"میرے نزدیک گسستن، عین اسلام ہے اور پیوستن، رہبانیت یا ایرانی (غیر اسلامی) تصوف ہے اور میں اسی غیر اسلامی تصوف کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہوں۔"

ان کے صوفیانہ ذہن کی اس سے بہتر اور کون سی دلیل ہوسکتی ہے کہ بہت بڑے صوفی رومی ان کے مرشد ہیں:

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اے اقبال اپنے آپ کو
آپ ہی گویا مسافر، آپ ہی منزل ہوں میں

جو ہے بیدار انساں میں وہ گہری نیند سوتا ہے
شجر میں، پھول میں، حیواں میں، پتھر میں، ستارے میں

یہاں اقبال کے تصوف پر بحث کرنا مقصود نہیں، کیونکہ نہ تو یہ اس کا موقع ہے، دوسرے یہ کہ وہ بجائے خود ایک مقالہ ہو جائے گا، بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ غزل کی روایت ان کے یہاں کبھی سامنے آکر اور کبھی چلمنوں کے پیچھے سے کسی نہ کسی طرح جلوہ افروز ضرور ہو جاتی ہے اور یہ فنی پختگی

آگے چل کر ان کا مقصد غالب ہوتے ہوئے بھی فن کو کہیں مغلوب نہیں ہونے دیتی، وہ غزل کے تمام مروجہ اسالیب و موضوعات پر طبع آزمائی کرتے ہیں، لیکن داغ و امیر کی معاملہ بندی اور حسن پرستی ان سے جلد ہی چھوٹ گئی اور وہ سوز دل اور معرفت نفس کی منزل میں داخل ہو گئے، داغ کے یہاں زبان کی چاشنی اور مضامین کی تکرار اقبال پر دائمی اثر نہ چھوڑ سکی، اقبال فکر کے پیکر تھے، داغ کی صناعی، تکلف اور ان کی غیر دائمی حلاوت سے سیری ہو جانے کے بعد فطری طور پر ان کی طبیعت کو کلام غالب سے لگاؤ پیدا ہوا، اقبال اور غالب دونوں کی ذہنی بلندی کا معیار تقریباً ایک ہی تھا، اقبال کے یہاں وہی گہرائی ہے جو غالب کے یہاں ہے، اقبال نے غالب سے معنوی فیض حاصل کیا اور بہت سی غزلیں غالب کے رنگ میں کہیں، نمونہ کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار میں غالب کا عکس نظر آتا ہے:

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

نظارے کو تو جنبش مژگاں بھی بار ہے نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

جرس ہوں نالہ خوابیدہ ہے میری ہر رگ و پے میں ٭ یہ خاموشی مری وقت رحیل کارواں تک ہے

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے گمرہی رستہ نہ ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

وہ مے کش ہوں فروغ مے سے خود گلزار بن جاؤں ٭ ہوائے گل فراق ساقیٔ نامہرباں تک ہے

اقبال نے غالب سے معنوی فیض حاصل کیا، جس کا اثر ان پر دیرپا ہوا، اسی لئے شیخ عبدالقادر نے بانگ درا کے دیباچے میں لکھا ہے کہ اقبال اور غالب میں بہت سی باتیں مشترک ہیں، اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ غالب نے دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔

کسی بھی شاعر کی بلندی کو پرکھنے کے لئے مستند اور کلاسیکی شعرا سے اس کا موازنہ کیا جاتا ہے، اقبال اس حیثیت سے بھی بہت بڑے غزل گو ہیں کہ غالب کے علاوہ ان کے یہاں بادشاہ غزل

میر تقی میر کا خاص رنگ بھی ملتا ہے؛ بہت سے درد و اثر والے اشعار ان کے یہاں مل جاتے ہیں:

کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہل محفل چراغ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں

خرمن تو پہلے دانہ دانہ چن کے تو آہی نکلے گی کوئی بجلی جلانے کے لئے

میر کے شرارے اقبال کے خیال میں حل ہو کر اپنی رعنائی اور دلفریبی سے انسانی ذہن کو مسحور کرتے ہیں، اسی لئے اقبال کو میر اور غالب کا مرکب کہا جائے تو نامناسب نہیں ہے۔

اقبال نے اپنے قیام یورپ کے زمانہ میں ایک معرکۃ الآرا غزل لکھی تھی جو ان کی شاعری میں اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے، یہیں سے ان کا انقلابی رجحان واضح ہونے لگتا ہے اور ان کی مینائے سخن میں صہبائے ملت کی رنگینیاں نظر آتی ہیں، اس غزل کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدار یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

گذر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہاں میخانہ کہ ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا

اسی میں اپنی عالم دوستی کا اظہار یوں کرتے ہیں:

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

یہ انقلابی رجحانات مزید ترقی کرتے ہیں اور یہیں سے ان کی غزل کا تابناک دور شروع ہوتا ہے،

کب تک رہے محکومی انجم میں مری خاک یا میں نہیں یا گردش افلاک نہیں ہے

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

یہ طرز اور یہ پیغام اقبال کو روایتی غزل سے بہت بلندی پر پہونچا دیتا ہے اور پھر یوں کہتا ہے:

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی

قیام یورپ میں اقبال نے مہ جبینانِ یورپ کا مطالعہ بھی کیا، انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ فروغ مے سے ان کے چہرے گلستاں تو ہو سکتے ہیں لیکن وہ فطری ملاحت اور پرخلوص محبت! جو نازنینانِ ہند کا طرۂ امتیاز ہیں، ان میں قطعی طور پر مفقود ہیں، وہ کشش و رعنائی جو محبوب غزل کے ایک بار دیکھنے سے ہی اپنا اسیر بنا لیتی ہے، ہزاروں خوبرویانِ یورپ کے مطالعہ و مشاہدہ کے بعد بھی اقبال کو کہیں نظر نہ آئی، بلکہ ان کے دیدار نے اقبال پر منفی اثر ڈالا:

کوئی دل ایسا نظر نہ آیا نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا
الٰہی تیرا جہان کیا ہے، نگارخانہ ہے آرزو کا

اقبال اس جذبہ کا اظہار کرنا چاہتے تھے جو یورپ میں رہ کر وہاں کے تمدن اور کلچر کے خلاف شدت سے ان کے دل میں پیدا ہوا تھا، لیکن کر نہیں سکتے تھے، جس کا اشارہ اس شعر میں ملتا ہے:

زمانہ دیکھے گا جب مرے دل سے محشر اٹھے گا گفتگو کا
مری خموشی نہیں ہے گویا، مزار ہے حرف آرزو کا

غزل میں اپنی بات رمزیہ انداز میں کہنا زیادہ پسند کیا جاتا ہے، اردو و فارسی شاعری رمز نگاری کی دولت سے مالا مال ہیں، اقبال کے یہاں زندگی کا مفہوم بہت وسیع ہے، اقبال نے زندگی کے متعلق بیحد تشبیہیں، استعارے استعمال کئے ہیں، زندگی کا مفہوم وسیع ہونے کی وجہ سے ان کے رمز و کنایہ میں ایک جہانِ معنی پنہاں ہوتا ہے اور رمز نگاری کے بہترین نمونے ملتے ہیں، اقبال کو اپنے تغزل کے جمالیاتی محاسن کا احساس تھا اس لئے انھوں نے کہا تھا:

مری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ وہ بھی حرام اے ساقی

رمزیت، جوشِ بیان، نیز اس کی ایمانی قوت اقبال کی اہم خصوصیت ہے، وہ حسن ادا کے جادو سے انسانی ذہن کو مسحور کر لیتا ہے، غزل کا حقیقی سرمایہ شاعرانہ رمز و کنایہ میں پوشیدہ ہے، ان کا رمز و کنایہ ممتاز ہے اور مردہ نہیں ہے، وہ ان کے ذریعہ بڑی خوبی سے نئے نئے مضمون پیدا کرتے ہیں۔

اقبال کے یہاں مستقل اجتماعی پیغام حیات ہے، انھوں نے اس بات پر زیادہ زور دیا کہ غزل کو دل کے اسرار پنہاں کے اظہار کا وسیلہ بنانے سے بہتر یہ ہے کہ ذہنی قوتیں اس پر صرف ہوں اور ذہن و غزل میں باہمی طور پر ہم آہنگی پیدا ہو جائے اسی لئے ان کے یہاں فکر و احساس ہر جگہ نمایاں ہے:

اس چمن میں مرغِ دل گائے نہ آزادی کا گیت
آہ یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کے لئے

اقبال کی غزلوں میں الفاظ و معانی کی موزونیت، مضمون کی بلندی، طرز ادا کی شوخی و ندرت، ترکیبوں کی نزاکت اور تقابل و تناسب، بلاغت کلام اور ذوق لطافت کے اعلیٰ نمونوں کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں غنائی عنصر کا بھی اظہار ہے، ان کی بحریں مترنم اور موزوں ہوتی ہیں، نیز زمین شگفتہ اور مضمون کے مناسب وزن منتخب کرنے کا خاص خیال رکھتے ہیں، ان کے یہاں موضوع بدلتا ہے تو لب و لہجہ میں بھی تبدیلی آجاتی ہے، الفاظ کے استعمال کا معیار بھی بدل جاتا ہے، دراصل الفاظ خود اچھے یا برے دلکش یا بے کیف نہیں ہوتے، ان کا استعمال ہی ان کا معیار متعین کرتا ہے۔

اقبال، جہاں جیسا بیان ہوتا ہے اسی کے مناسب الفاظ لاتے ہیں، انھوں نے غزل میں لہجہ کے جوش اور زور سے شکوہ پیدا کیا، انقلابی رجحان دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ پر شکوہ لہجہ اختیار کرکے کلام میں وہی لطف اور گھلاوٹ پیدا ہو سکتی ہے جو سادے الفاظ تک ہی محدود سمجھی جاتی ہے، غزل کی مروجہ زبان کو جو نازک، شیریں، لطیف اور خوش گوار تھی، اقبال نے اپنے خیال کے خاص سانچے میں ڈھال کر اپنے موضوع کا تابعدار بنایا اور ساتھ ہی اپنی شاعری پر تبصرہ بھی کر دیا کہ:

مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی ——— کہ بانگ صورِ سرافیل دلنواز نہیں

حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھکو ——— نہ کر خارا شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا

بال جبریل کا یہ خاص لب ولہجہ ان کی فلسفیانہ اور درد مندانہ شخصیت کی تشکیل کا سبب ہوا۔ اقبال ہمارے سامنے کبھی فلسفی، کبھی واعظ و مصلح اور کبھی ایک دردمند انسان بن کر آتے ہیں اور موضوع کی عین مناسبت سے ان کا لب ولہجہ بدلتا رہتا ہے۔ کبھی ان کے یہاں سوز و گداز کا دریا بہتا ہے، مثلاً

متاعِ بے بہا ہے درد و سوز و آرزو مندی

مقام بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

اس شعر میں یوں تو انھوں نے فقط سوز و گداز سے محبت کا اظہار کیا ہے لیکن یہاں خود ان کا سوز و گداز نمایاں ہو رہا ہے:

اقبال نے غزل کو تو غزل ہی رہنے دیا لیکن اس میں اتنے اور ایسے موضوعات داخل کیے کہ غزل کی دنیا میں غالب کے علاوہ کوئی ان کی ہمسری نہیں کر سکتا، انھوں نے غزل کے روایتی مزاج میں تنوع اور رنگا رنگی پیدا کر کے مسلسل غزلیں بھی اپنی انفرادی شان کے ساتھ لکھیں، جن میں غزل و نظم کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ان میں کہیں تکلف اور تصنع سے نہیں بلکہ برجستگی اور بے تکلفی کی وجہ سے بڑی ... تاثیر پیدا ہو گئی ہے:

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباس مجاز میں

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا

ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

اقبال کی ایک مسلسل غزل کے چند اشعار درج ذیل ہیں جن سے ان کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے:

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر ——— ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں ——— یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں ——— کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل ——— آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

اس غزل کے ہر شعر میں شوخی بھری ہوئی ہے، ہر لفظ سے ناز و نیاز افشا ہو رہے ہیں، اس سے شاعر کے تخیل کی بلندی، احساس کی شدت اور گہرائی اور پیرایۂ بیان کی بے تکلفی ظاہر ہو رہی ہے، خدا سے کہتے ہیں کہ تو نے حضرت آدمؑ کو دنیا میں بھیج دیا اور اب بلانا چاہتا ہے، تو ہم بھی یوں ہی نہ آجائیں گے، ہمیں اس وسیع دنیا میں بہت سے کام کرنا ہیں، اب تجھے انتظار کرنا ہوگا اور اگر روز محشر میں میری رسوائی ہوگی تو وہ تیری بھی رسوائی ہے، اگر انسان پر زوال آتا ہے تو وہ زوال خود تیرا زوال ہے، کیونکہ انسان کی تابانی سے تیرا جہاں روشن ہے:

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن

زوالِ آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

اسی طرح اور جگہ بھی معاملات شوق کا روئے سخن خدا کی طرف ہے، جو شوخی و بیباکی سے لبریز ہے:

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا ——— یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

اقبال کی غزلوں کی زبان شیریں، مضمون بلند اور خیالات میں حکیمانہ گہرائی ہے، نرم سیر دریا کی طرح ان کی غزلوں میں لطیف روانی ہوتی ہے:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

اسی شب و روز میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

اقبال ایک فکر خاص کے شاعر اور بلند اخلاقی قوت حیات کے قدرداں ہیں، اسی لئے ان کے یہاں بلبل اور قمری کی مروجہ تشبیہ پر باز اور شاہین کو ترجیح دی گئی ہے، 'چیونٹی اور عقاب' میں اور 'شاہین' میں اس کی وضاحت ملتی ہے۔ وہ اپنے جذبات کی ہم آہنگی چاہتے ہیں، ان کے نزدیک کوئی شاعر اگر زندگی کو فروغ اور فراوانی نہ بخش سکے، اس کے آرٹ سے مسرت اور بصیرت میں اضافہ نہ ہو سکے، اگر اس سے حقائق کے الجھے ہوئے تار سلجھ نہ سکیں تو وہ آرٹ بے معنی اور مہمل ہے، اسی لئے ان کی غزلوں میں فن کیساتھ مقصد بھی شامل ہے، حرکت بھی، کیفیت بھی، سرشاری بھی، تاثیر بھی، جوش بھی، جذبہ بھی، بصیرت بھی، قلندری بھی، درد بھی اور تڑپ بھی ہے۔ وہ بہت بڑے غزل گو ہیں اور اس حقیقت سے واقف بھی ہیں:

اے اہل نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ ہنر کیا

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

امیر فتح اللہ شیرازی

از

جناب سبط محمد نقوی صاحب اکبر پور فیض آباد

"......درس نظامیہ ہندوستان کی علمی تاریخ اور علمی زبان کا سب سے زیادہ نمایاں لفظ ہے، ہندوستان میں آج کلکتہ سے پشاور تک جس قدر تعلیمی سلسلے پھیلے ہیں سب اسی درس کی شاخیں ہیں، کوئی عالم، عالم نہیں مانا جا سکتا جب تک ثابت نہ ہو کہ اس نے اس طریقۂ درس کے موافق تعلیم حاصل کی ہے"...[1]

یہ وہ الفاظ ہیں جن میں علامہ شبلی نعمانی نے درس نظامی کے ہندوستان میں وسیع و ہمہ گیر اثر کا ذکر فرمایا ہے، حق یہ ہے کہ آج اس برکوچک میں جہاں بھی مشرقیات کا کچھ حصہ ہے وہ اسی درسِ نظامی کا فیضان ہے،

یہ نصاب درس خانوادۂ فرنگی محل کے بانی و موسس ملا نظام الدین سہالوی (۱۰۸۹-۱۱۶۱) کی نسبت سے درسِ نظامی یا درسِ نظامیہ کہلاتا ہے،... البتہ اس کا سراغ لگانا آسان نہیں کہ سب سے پہلے کس نے اُسے ملا نظام الدین کی طرف منسوب کیا،[2] علامہ شبلی نعمانی کا ارشاد ہے:-

---

[1] مقالات شبلی ج ۳ ص ۱۰۵، [2] بانی درس نظامی مصنفہ مولانا محمد رضا انصاری فرنگی محلی ص ۲۵۹

"درس نظامی اگرچہ ملا نظام الدین صاحب کی طرف منسوب ہے لیکن درحقیقت اس کی تاریخ ایک پشت اوپر سے شروع ہوتی ہے یعنی ملا نظام الدین کے والد سے جن کا نام ملا قطب الدین شہید تھا۔"[۵۱]

بہرکیف اس نصابِ درس کی تاسیس چاہے نامور فرزند کے ہاتھوں ہوئی ہو، یا باکمال والد کے جس ہندوستانی عالم پر ان حضرات کا شجرۂ تلمذ تمام ہوتا ہے وہ مولانا عبدالسلام لاہوری کی ذاتِ گرامی ہے، اس علمی شجرے پر تقریباً سبھی علمائے سیر و سوانح متفق ہیں۔

ملا عبدالسلام لاہوری

ملا عبدالسلام دیوئی

ملا دانیال چوراسی

ملا قطب الدین شہید

قطب الدین شمس آبادی — امان اللہ بنارسی

ملا نظام الدین صاحبِ درسِ نظامیہ

لیکن یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ ملا نظام الدین نے ہرچند تکمیل تحصیل اپنے پدر عالی قدر کے تلامذہ ملا قطب الدین شمس آبادی، اور ملا امان اللہ بنارسی کے حضور میں کی لیکن وہ اپنے والد بزرگوار کے بلاواسطہ شاگرد بھی تھے۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی کہتے ہیں، کہ "ملا نظام الدین صاحب نصاب نظامیہ کو خود اپنے والد ملا قطب الدین سہالی سے استفادہ کا موقع جیسا کہ چاہئے تھا، نہ مل سکا"[۵۲] یعنی مولانا ملا صاحب کے اپنے والد سے براہ راست استفادے کی مطلق نفی نہیں کرتے، بلکہ یہ

۵۱ مقالات شبلی (تعلیمی) ص ۲۶۱، ۵۲ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت ج ۱ ص ۳۰۱

استفادہ کما حقہ نہیں ہوسکا، تقریباً یہی خیال ملا صاحب کے سوانح نگار مولانا محمد رضا انصاری کا بھی ہے۔ لکھتے ہیں کہ اساتذہ میں سب سے پہلے خود والد ماجد ملا قطب الدین تھے، جن کی حیات میں شرح ملا جامی تک اُن کی تعلیم ہو چکی تھی، گو پوری قطعیت کے ساتھ سند اور ثبوت کے بغیر کہنا ممکن نہیں کہ ملا شہید کی حیات میں جس قدر تعلیم ہوئی، وہ سب ان ہی سے حاصل کی لیکن قرین قیاس یہی معلوم ہوتا ہے، کہ فاضل اور معلم باپ نے ہونہار فرزند کی تعلیم کی طرف بذات خود توجہ کی۔[۵۳]

اس لئے یہ تسلیم کر لینا حق بجانب ہے کہ قطب الدین شمس آبادی اور امان اللہ بنارسی کے واسطے کے بغیر بھی ملا نظام الدین کو اپنے پدر بزرگوار سے شرف تلمذ میسر تھا، اور اس طرح بھی اُن کا سلسلۂ تلمذ ملا عبدالسلام لاہوری تک پہنچتا ہے، ان ملا لاہوری کا استادانہ مرتبہ کیا تھا، اس پر تفصیلی گفتگو کا یہاں موقع نہیں ہے، ربط کلام کے لئے محض اشارات سے کام لینا ہے اسلئے آپ مولانا گیلانی کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں:-

"…. مولانا غلام علی آزاد نے بھی ملا عبدالسلام کے متعلق "معدن عقلیات و نقلیات بود" لکھ کر اُن کے اساتذہ میں صرف میر فتح اللہ شیرازی کا ذکر کیا ہے جس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے، کہ ملا عبدالسلام کے ممتاز استادوں میں میر فتح اللہ کے سوا کوئی دوسرا آدمی نہیں ہے اور یہ کہ وہ براہ راست میر فتح اللہ ہی کے ساختہ پرداختہ ہیں، ملا عبدالسلام کی سب سے بڑی خصوصیت مولانا آزاد نے یہ بیان فرمائی ہے کہ

قریب شصت سال درس گفت — تقریباً ساٹھ سال درس و تدریس

و جمع کثیر را بہ پایۂ فضیلت رسانید — کا کام کیا اور بہتوں کو فاضل

۵۳ بانی درس نظامی ص ۶۱

... نو وسال عمر یافت، بنایا، نوے سال عمر پائی"[۵۱]

(مآثر ص ۲۳۶)

اس طرح سے میر فتح اللہ شیرازی کو درس نظامی کے استاذ الاساتذہ اور معلم اوّل کی حیثیت حاصل ہے بعض ارباب علم کا، — جن میں مولانا مناظر احسن گیلانی سرِ فہرست کی حیثیت رکھتے ہیں یہ خیال ہے کہ درس نظامی میں عقلیات کی جو گراں باری ہے، وہ میر فتح اللہ شیرازی کے عقلیاتی رجحان کا ثمرہ ہے لیکن بانی درس نظامی کے مصنف محترم کو اس نظریے سے اتفاق نہیں، مگر اس کی تفصیل میں جانے کا نہ یہ مناسب محل ہے، اور نہ ان سطور کا کم سواد راقم اس کا اہل ہی ہے۔

اس بات کا شکوہ کرنے کی تو گنجائش نہیں ہے، کہ میر صاحب کے حالات کی طرف ہمارے ارباب سیر و سوانح کو التفات نہیں ہوا لیکن یہ ایک حقیقت ہو کہ میر صاحب کے حالات میں جس تحقیق و تدقیق کی ضرورت تھی، اوسے بروئے کار نہیں لایا گیا، آج ہمیں اُن کے ابتدائی حالات، یہاں تک کہ اُن کے والد ماجد تک کا نام صحیح طور سے معلوم نہیں، جن مصنفات کو میر صاحب کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے، اس کا سبب بھی غلط فہمی ہی معلوم ہوتی ہے، ہوا یہ کہ دربار اکبری میں مولوی محمد حسین آزاد نے اس بنا پر کہ شیخ ابو الفضل نے اکبر نامہ میں مجملاً اتنا لکھا ہے کہ علوم و فنون میں مفید تصنیفیں لکھی تھیں، اور ایک تفسیر بھی لکھی تھی، تفسیر منہج الصادقین کو میر صاحب کے خزینۂ خدمات میں جمع کر دیا، اگرچہ خلاصۃ المنہج کے بارے میں مذبذب معلوم ہوتے ہیں، کہتے ہیں کہ یہ ملا فتح اللہ کی تفسیر کہلاتی ہے"[۵۳] پھر اس کے بعد مولانا حکیم سید عبد الحئی اور مولانا سید محمد حسین نوگانوی کے علاوہ زمانۂ حال کے بعض ایرانی مصنفین بھی سب اسی راہ پر چلے جا رہے ہیں، بلکہ نہج البلاغہ کا فارسی ترجمہ (شرح نہج البلاغہ) بھی کسی وقت میر صاحب کے نام لکھ دی گئی لیکن معارف کے فاضل مضمون نگار

---

[۵۲] ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اوّل ۲۹۹ [۵۲] دربار اکبری طبع لاہور سنہ ۱۹۳۹ء ص ۶۸۱،

[۵۳] ایضاً ص ۶۸۰

جناب معین الدین رہبر فاروقی صاحب نے میر صاحب پر ایک مفصل و معلوماتی مضمون لکھتے ہوئے جس میں اُن کی موجدانہ حیثیت کو بڑی لیاقت سے اجاگر کیا گیا ہے، شاید پہلی مرتبہ اس شک کا اظہار کیا، کہ منہج الصادقین ان کی تصنیف ہے، کہتے ہیں:-

"ہم جن فتح اللہ کا حال لکھ رہے ہیں وہ شیراز کے رہنے والے ہیں لیکن اس تفسیر میں کاشانی نے لکھا ہے، یہ تحقیق طلب ہے کہ دونوں میں کون سا بیان صحیح ہے۔"[۵۴]

مدیر معارف مولانا سید صباح الدین عبد الرحمٰن نے اپنی گراں قدر تصنیف بزم تیموریہ میں اس مسئلہ کی زیادہ تنقیح کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی، رہبر صاحب کی نظر سے تفسیر منہج الصادقین طبع ۱۳۱۰ھ گذری تھی لیکن شاید اس اشاعت میں ترجمۃ المصنف شامل نہیں تھا، اس لئے وہ ملا فتح اللہ کاشانی کے حالات سے آگاہ نہیں ہو سکے، چونکہ تفسیر مذکور کی بعد کی اشاعتوں میں مصنف کے حالات شامل کئے گئے ہیں، جن کا مطالعہ اس رجحان کو بے حد تقویت پہونچاتا ہے کہ ملا فتح اللہ کاشانی صاحب تفسیر اکبری دربار کے امیر فتح اللہ شیرازی معقولی سے مختلف بزرگ ہیں، ملاحظہ ہو:-

"... المولی المعظم ملا فتح اللہ بن ملا	بزرگ عالم ملا فتح اللہ بن شکر اللہ
شکر اللہ بن لطف اللہ کاشانی'	ابن لطف اللہ کاشانی دسویں صدی
عالمے است ...... از فحول علمائے	ہجری کے فحول علمائے شیعہ میں تھے'
امامیہ اواخر قرن دہم ہجرت و	تمام علوم دینیہ میں ید طولیٰ رکھتے
در تمامی علوم دینیہ طویل الباع	اور بیحد باخبر تھے، خصوصاً علم تفسیر

---

[۵۴] رسالہ معارف دار المصنفین اعظم گڈھ، بابت جون سنہ ۴۳ء ص ۴۶۲ حاشیہ نمبر ۲،

ووسیع الاطلاع وبالخصوص در علم
شریف تفسیر..... ووے از تلامذۂ
یگانہ مفسر مشہور امامی علی بن حسن
زواری بودہ وبواسطۂ او از شیخ
اجل محقق ثانی علی بن عبد العالی
کرکی روایت می نماید تالیفات
طریفہ متنوعہ وے بہترین معرف
تبحر وتبحر علمی وکمال او بودہ.....

(۱) ترجمۂ فارسی احتجاج طبرسی
..... وآن را برائے شاہ طہماسپ
صفوی (۹۳۰ھ – ۹۸۴ھ) تالیف
دادہ.......

(۵) زبدۃ التفاسیر قرآن مجید و
آن را بعد از دو تفسیر دیگرش
منہج الصادقین وخلاصۃ المنہج
تالیف دادہ - او در نیمہ ذی قعدہ
سال (۹۷۷) بپایانش رسانیدہ
...... وفات وے در سال نہصد
ہشتاد وہشتم ہجری قمری واقع

ہیں اور وہ مشہور شیعہ مفسر علی بن
حسن زواری کے ممتاز شاگردوں
میں تھے، اور ان ہی کے واسطے سے
شیخ اجل محقق ثانی علی بن عبد العالی
کرکی سے روایت کرتے تھے، اور
اُن کی تازہ اور متنوع تالیفیں
اُن کے علمی تبحر ومہارت کی
معرف ہیں،

(۱) ترجمۂ فارسی احتجاج
طبرسی اور اسے شاہ طہماسپ
صفوی (۹۳۰ھ – ۹۸۴ھ) کے لئے
تالیف کیا،

(۵) قرآن مجید کی زبدۃ التفاسیر
نامی تفسیر جسے اپنی اور دو تفسیروں
منہج الصادقین اور خلاصۃ المنہج
کے بعد تالیف کیا، اور وسط ذی
قعدہ ۹۷۷ھ میں مکمل کیا، اُن کی
وفات ۹۸۸ھ میں واقع ہوئی،
اور جملہ ملاذ الفقہا سے مادہ تاریخ

وجملہ (ملاذ الفقہا) مادۂ تاریخ او   وفات برآمد ہوتا ہے،"
می باشد"[1]

ان حالات میں اگر فکر وتدبر سے کام لیا جائے، تو جو نتیجے مستفاد ہوتے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں،

(۱) ملا فتح اللہ کاشانی صاحب تفسیر کے استاذ علی بن حسن زواری ہیں، جب کہ امیر فتح اللہ شیرازی کے اساتذہ میں ان بزرگ کا نام نظر قاصر سے نہیں گزرا، امیر شیرازی کے مشہور ومعروف اساتذہ ہیں خواجہ جمال الدین محمود، غیاث الدین منصور شیرازی کمال الدین شیرازی اور احمد کرد،"

(۲) امیر فتح اللہ شیرازی ۹۶۵ھ سے قبل ہی بیجاپور تشریف لا چکے تھے، اور ۹۹۰ھ سے ۹۹۷ھ میں اپنی رحلت تک ہندوستان ہی میں رہے، اس لئے ۹۷۷ھ میں شاہ طہماسپ صفوی کے لئے تفسیر کی تالیف ممکن نہیں،

(۳) ملا کاشانی فقیہ تھے، اور حدیث میں بھی اجازۂ روایت رکھتے تھے، آپ کے لئے معقولات سے شغف کی روایت نہیں ملتی، اسی طرح فقہ وحدیث میں ملا شیرازی کی دلچسپی کا کوئی ثبوت نہیں ہے، مغل اعظم اکبر کے دربار میں ان کی جو سرگرمیاں ذکر کی جاتی ہیں ان کو محدث وفقیہ کے تقدس سے کوئی ربط بھی نہیں،

(۴) امیر شیرازی کی تاریخ وفات "فرشتہ بود" سے ۹۹۷ھ برآمد ہوتی ہے، اگر یہی ایک مادہ تاریخ ہوتا تو غلطی یا غلط فہمی کا قیاس بھی ہو سکتا تھا، مگر مولوی محمد حسین آزاد فرماتے ہیں کہ

---

[1] یہ حالات منہج الصادقین طبع چاپ خانہ محمد حسن علی طہران ۱۳۳۳ھ سے جناب مولانا الحاج سید ظفر الحسن صاحب پرنسپل جامع العلوم جوادیہ کالج بنارس نے ازراہ کرم نقل فرما کر روانہ فرمائے ہیں صفحہ کا نمبر معلوم نہیں ہو سکا،

"عرفی ساوجی نے اُن کے رنج کو حکیم ابو الفتح کے غم سے ترکیب دے کر عمدہ مادہ تاریخ نکالا ہے،

امروز دو علامہ ز عالم رفتند　　رفتند و موخر و مقدم رفتند

چوں ہر دو موافقت نمودند بہم　　تاریخ بشد کہ ہر دو باہم رفتند"[1]

اس کے علاوہ اعیان الشیعہ میں السید تقی الدین شیرازی کے حالات کے ضمن میں ایک نام اس طرح آیا ہے، "السید شاہ فتح اللہ الکبیر بن حبیب اللہ الحسینی الشیرازی"[2] اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ باخبر مصنفین امیر فتح اللہ شیرازی کو ملا فتح اللہ کاشانی سے ممتاز کرنے کے لئے الکبیر کی صفت سے متصف کرتے تھے، یہ معلوم نہیں کہ یہ کبر سن کی وجہ سے تھا، یا کسی اور سبب سے اسی اقتباس سے یہ نتیجہ بھی برآمد ہوتا ہے، کہ امیر فتح اللہ شیرازی کے والد ماجد کا اسم گرامی حبیب اللہ تھا لیکن اس کا بھی احتمال ہے کہ ابن حبیب اللہ الحسینی الشیرازی کا جملہ سید تقی الدین کیلئے ہو لیکن یہ نہایت نادر و شاذ اتفاق ہوگا، کہ دو معاصر مشاہیر ایسے ہوں کہ جن کا نام اور ولدیت دونوں ایک ہوں،

ایک تیسری بات بھی ہے جو ملا فتح اللہ شیرازی اور ملا فتح اللہ کاشانی کو الگ الگ شخصیت قرار دینے کے حق میں دلیل قوی کی حیثیت رکھتی ہے، موخر الذکر کی نسبت ایک نادر الوقوع واقعے کی شہرت ہے، بیان یہ کیا جاتا ہے کہ ایک بار آپ سکتے میں مبتلا ہو گئے، اور مردہ سمجھ کر سپرد خاک کر دیئے گئے، جب قبر کے اندر سکتہ دفع ہوا تو آپ کو ہوش آیا تو یہ نذر کی کہ اگر میں اس ہلاکت سے نجات پا سکوں گا تو قرآن مجید کی تفسیر تحریر کروں گا، بہر حال آپ قبر کن کے یا کسی اور وسیلے سے قبر سے باہر نکلے، اور شکرانہ نعمت و ایفائے نذر کے طور پر اپنی حیات ثانی میں یہ خدمت انجام دی،

---

[1] دربار اکبری ص ۹،۷ [2] اعیان الشیعہ ج ۴۲ ص ۱۱۸۹،

اگر یہ افتاد امیر فتح اللہ شیرازی کی ہوتی، تو ناممکن تھا کہ ایسے عجوبۂ روزگار واقعے کے ذکر سے معاصر مورخ باز رہتے، بہر کیف راقم السطور یہ گزارش اہل علم و نظر کے ملاحظہ کے لئے بغرض استصواب پیش کرتا ہے، جن حضرات کو استدلال سے اتفاق نہ ہو یا مسئلۂ زیر بحث میں کوئی اور نقطۂ نظر یا خاص معلومات رکھتے ہوں، وہ سے منظر عام پر لانے کی زحمت کر کے اس حیرانی کو دور فرمائیں، تاکہ برصغیر کے اس استاذ الاساتذہ کے صحیح حالات کی تدوین ہو سکے،

یہ گزارش بھی ضروری ہے کہ کیا زبدۃ التفاسیر، منہج الصادقین اور خلاصۃ المنہج کے علاوہ کسی ایسی تفسیر کا پتہ چلتا ہے، جو فتح اللہ شیرازی کی طرف منسوب ہو، شیخ ابو الفضل کو ملا فتح اللہ شیرازی سے جو تعلق تھا، اس کی بنا پر ان کا بیان نظر انداز کرنے کے لائق نہیں ہے، یہ اور بات ہے کہ نقل میں کسی سے غلطی ہو گئی ہو، بہر حال مسئلہ تحقیق طلب ہے،

وفیات

مولانا محمد یوسف بنوریؒ

از

عبدالسلام قدوائی ندوی

۱۹۲۷ء کا زمانہ تھا، میں اس وقت ندوہ میں پڑھتا تھا، درس کے دوران اور بحث و تحقیق کے سلسلہ میں مولانا انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ ہوتا تھا، ہمارے استاذ مولانا حیدر حسن خاں صاحب شاہ صاحب سے بخوبی واقف تھے، اُن کی مجلس میں شاہ صاحب مرحوم کی وسعتِ علم، بے نظیر حافظہ، ندرتِ فکر، اور دقتِ نظر کا ذکر آتا تھا، شاہ صاحب کے بعض شاگرد بھی کبھی کبھی آجاتے اور اپنے استاد کے علم وکمال کا والہانہ ذکر کرتے، گرمیوں کی چھٹی میں مولانا سید طلحہ پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور لکھنؤ آتے، مولانا حیدر حسن خاں صاحب مرحوم اُنکے شفیق استاد تھے، ٹونک اُن کا وطن تھا، اس طرح تلمذ کے ساتھ وطن کی مشارکت بھی اُن کو ندوہ لاتی، اور بعض اوقات کئی کئی دن مولانا حیدر حسن خاں کے ہاں ان کا قیام رہتا، مولانا طلحہ کی عقیدت اور مولانا حیدر حسن خاں کی شفقت قابلِ دید ہوتی،

مولانا سید طلحہ صاحب نے مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ کو قریب سے دیکھا تھا، اور ان کے حلقۂ درس میں کئی بار بیٹھے تھے، اُن کی مخصوص صحبتوں میں بھی شریک ہوئے تھے علوم اسلامیہ پر خود اُن کی اچھی نظر تھی، خصوصاً تفسیر حدیث، اور رجال کا بہت اچھا مطالعہ تھا، حافظہ بھی

غضب کا پایا تھا، لیکن بایں ہمہ وہ شاہ صاحب سے بہت زیادہ متاثر تھے، اور اُن کی وسعتِ نظر، حفظ و اتقان، مہارتِ علوم، اور مجتہدانہ صلاحیت کے بیحد معترف تھے، اُن کا تذکرہ بڑے کیف و وجد کے ساتھ کرتے، کہا کرتے تھے، کہ اگر میں نے مولانا انور شاہ صاحب کو نہ دیکھا ہوتا، اور اُن کے حافظے کا ذاتی تجربہ نہ ہوتا، تو مجھے ان روایتوں کو تسلیم کرنے میں تامل ہوتا جو کتابوں میں سلف کے حافظے کے بارے میں درج ہیں، لیکن شاہ صاحب کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ جس امت کے پچھلوں کا یہ حال ہے، اس کے اگلوں کی کیا کیفیت ہوگی،

یہ باتیں سُن کر مجھے اور میرے ساتھیوں کو بھی شاہ صاحب علیہ الرحمہ سے بڑی عقیدت پیدا ہوگئی، دیکھنے کا اتفاق تو اس کے کئی برس بعد ہوا، لیکن دل پر اُن کی عظمت کا نقش اسی وقت سے قائم ہو گیا تھا، شاہ صاحب کے شاگردوں کے نام بھی کبھی کبھی کان میں پڑتے تھے، مولانا حفظ الرحمٰن، مفتی عتیق الرحمٰن، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا محمد یوسف بنوری اور مولانا احمد رضا کے نام بار بار سننے میں آئے، پھر جب مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مرحوم کے زمانۂ اہتمام میں دارالعلوم دیوبند میں عظیم الشان اسٹرائک ہوئی، اور مولانا انور شاہ صاحب مفتی عزیز الرحمٰن، مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ متعدد بزرگوں نے استعفا دیکر دارالعلوم سے علیحدگی اختیار کی، تو عرصہ تک اخبارات میں ان واقعات کا چرچا رہا، بعض اخبارات تو محض انھیں مسائل پر بحث کے لئے نکالے گئے تھے، یہ اسٹرائک بڑی خطرناک تھی، اور ڈر تھا کہ کہیں بزرگوں کی نصف صدی کی کمائی خاک میں نہ مل جائے، لیکن اللہ نے اس کے نقصان سے بڑی حد تک محفوظ رکھا، ایک طرف مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم میں صدر مدرس اور شیخ الحدیث کے منصب کو سنبھال لیا، اور دوسری طرف بعض اہلِ خیر نے ڈابھیل (گجرات) میں شاہ صاحب اُن کے رفقا، اور شاگردوں کو بلاکر

ایک نئے علمی مرکز کی بنیاد رکھ دی، اساتذہ کی علمی شہرت، کارکنوں کی دل سوزی، اور معاونین کی دریادلی نے سارے ملک میں اس درسگاہ کا ایسا سکہ جما دیا، کہ تشنگان علم دور دور سے کھنچ کر اس چشمۂ صافی کے گرد جمع ہوگئے، اور ڈابھیل کے گلی کوچوں میں قال اللہ اور قال الرسول کے ترانے گونجنے لگے، شاہ صاحب کی صحت پہلے ہی اچھی نہ تھی، ڈابھیل کی مرطوب آب و ہوا اور مضر ثابت ہوئی، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے کام میں لگے رہے، اور جب تک صحت کی خرابی نے بالکل مجبور نہیں کر دیا، وہ یہاں سے نہیں ہٹے، ان کا قیام اگرچہ زیادہ عرصہ نہیں رہ سکا، مگر اس کے باوجود ڈابھیل دیوبند کا ثانی سمجھا جانے لگا، شاہ صاحب کے بعد ان کے مشن کو ان کے شاگردوں نے نہ صرف جاری رکھا، بلکہ اس میں چار چاند لگا دیئے، ان اصحاب میں مولانا محمد یوسف بنوری خاص طور سے قابل ذکر ہیں، انھوں نے درس و تدریس کے علاوہ ڈابھیل میں نشر و اشاعت کی غرض سے ایک علمی مجلس بھی قائم کی، جس کی طرف سے بہت سی بیش قیمت کتابیں شائع ہوئیں، شاہ صاحب کی سوانح عمری کے علاوہ ان کے افاداتِ درس بھی کئی ضخیم جلدوں میں مرتب کر کے شائع کئے گئے، ان میں بخاری کی شرح فیض الباری خاص طور سے قابلِ ذکر ہے، قدما کی کتابوں میں ہدایہ کی تخریج نصب الرایہ کی بڑی اہمیت ہے، لیکن پہلے یہ بہت ہی معمولی کاغذ پر چھپی تھی، اور اس کے نسخے بھی بہت کمیاب تھے، مولانا بنوری کا حدیث و فقہ کے طلبہ پر بڑا احسان ہے کہ انھوں نے مصری ٹائپ میں بہت اچھے کاغذ پر اس کتاب کی طباعت کا انتظام کیا، اور اس کے ساتھ بڑے عالمانہ حواشی تحریر کئے، جن کی وجہ سے اس کتاب کا افادہ بہت بڑھ گیا، حضرت شاہ ولی اللہ کی بعض نایاب کتابیں بھی اُن کی توجہ سے شائع ہوئیں، ملک کی تقسیم کے بعد انھیں بھی پاکستان جانا پڑا، لیکن ان کی علمی اور تعلیمی سرگرمیاں

وہاں بھی جاری رہیں، بلکہ ہندوستان سے بھی زیادہ وہاں انھوں نے علم و دین کی خدمت کی، کراچی میں ایک درس گاہ کی بنیاد ڈالی جس نے ان کی زندگی ہی میں بڑی مرکزیت حاصل کر لی، اس درسگاہ کے ساتھ ایک ماہنامہ "بینات" بھی جاری کیا، جو اپنے دقیع علمی و دینی مضامین کی وجہ سے بہت ممتاز ہے، ہندوستان کی طرح پاکستان میں بھی عربی مدارس کے درمیان کوئی رشتہ، ارتباط نہیں تھا، وہاں کے سرکاری حلقوں نے اس انتشار سے فائدہ اٹھانا چاہا، اور ان مدارس کو سرکاری سرپرستی میں لے کر مشرقی امتحانات کا مرکز بنا دینے کی کوشش کی، لیکن مولانا محمد یوسف بنوری مرحوم نے بڑی ہمت سے اس صورت حال کا مقابلہ کیا، اور آزاد عربی مدارس کا ایک وفاق بنا دیا، جو بہت مفید ثابت ہوا، جو حضرات عربی مدارس سے تعلق رکھتے ہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ کام کتنا مشکل تھا، اس کامیابی سے ایک طرف اُن کے اثر و رسوخ کا اندازہ ہوتا ہے، اور دوسری طرف سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں دینی اور علمی حلقوں میں کتنا اعتماد حاصل تھا، ان اہم کاموں کے علاوہ انھوں نے وہاں لامذہبیت اور بدعقیدگی کو بھی روکنے کی کامیاب کوشش کی، اس سلسلہ میں بعض اوقات انھیں حکومت سے بھی ٹکر لینی پڑی، لیکن انھوں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی، اُن کی اس ہمت اور استقامت کو دیکھ کر بعض دوستوں نے بے ساختہ کہا کہ یہ کسی بنوری ہی کا دل و گردہ تھا، ورنہ جنرل ایوب کے فوجی اقتدار کے زمانہ میں ایسی جرأت کی توقع کسی سے مشکل ہی سے کی جا سکتی تھی، وہ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے نامور خلیفہ شیخ آدم بنوری کی اولاد میں تھے، اور اُن کے اندر دینی حمیت، تجدیدی روح اور استقامت و ثبات قدمی انھیں کی وراثت کی بنا پر آئی تھی، جو شاہجہاں کے شان و شکوہ اور اسکے صاحب اثر وزیر سعد اللہ خاں کے جاہ و جلال کو خاطر میں نہیں لایا، اس کا نام لیوا ایوبی حکومت کی کیا

پرواہ کرتا، اُن کی ہمت و استقامت نے بہت سے ڈگمگاتے ہوئے قدموں کو سہارا دیا، الحاد و بے دینی کے اڈے ٹوٹ گئے، اور ملحدین کو راہ فرار اختیار کرنی پڑی، مسلم ممالک میں بھی اُن کا بڑا اثر تھا، اور اکثر اسلامی اور دینی کانفرنسوں میں انھیں شرکت کی دعوت دی جاتی تھی، اور اُن کے علم و تجربہ سے فائدہ اٹھایا جاتا تھا، میرا ان سے ملنا جلنا زیادہ نہیں ہوتا تھا مگر جب مل جاتے تو بڑی محبت سے پیش آتے ۷۶ء کے موسم حج میں اُن کے والد صاحب بھی ساتھ تھے، مجھے اُن سے خاص اہتمام سے ملایا، اور میرا تعارف بڑی تعریف و توصیف کے ساتھ اُن سے کرایا، جب بھی ملاقات ہوتی، بڑی خوش دلی اور بشاشت کے ساتھ ملتے، آخری بار ۷۷ء میں مکہ معظمہ میں ملاقات ہوئی، اس وقت کمزور بہت تھے، پیدل چلنا دشوار تھا، اس لئے سعی گاڑی پر کر رہے تھے، آخری ملاقات وہیں مسعیٰ میں ہوئی، پھر اس کے بعد ملنے کا موقع نہیں ملا، کئی مہینہ سے اُن کی بیماری، اور کمزوری کی خبریں آ رہی تھیں، بالآخر وقت موعود آ پہنچا، اور ۱۷؍اکتوبر ۷۷ء کو جان جان آفریں کے سپرد کر دی، اللہ انھیں اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے، اُن کے مراتب بلند فرمائے، اور اُن کے جانشینوں کو اُن کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے

انھوں نے علم دین کی خدمت کے لئے جو ادارے قائم کئے تھے، امید ہے کہ وہ برابر ترقی کرتے رہیں گے، اور اُن کے دائرہ کار میں مزید توسیع ہوتی رہے گی، تصانیف کے جو مسودے مکمل ہو چکے ہیں، اُن کی طباعت کا انتظام جلد ہونا چاہئے، اور جو ابھی نامکمل ہیں، اُن کی تکمیل کا بندوبست کرنا چاہئے، اس بارہ میں جامع ترمذی کی شرح خاص طور سے قابل ذکر ہے، امید ہے کہ اُن کے لائق جانشین اس کی تکمیل اور اشاعت کی خاص فکر کریں گے،

باب التقریظ والانتقاد

حیاتِ کلیم

مرتبہ ڈاکٹر سید محمد حسنین، ضخامت ۴۹۱ صفحات، کتابت و طباعت عمدہ،

ملنے کا پتہ :- شعبۂ اردو مگدھ یونیورسٹی، گیا۔

(ایک مبصر کے قلم سے)

حیات کلیم بہار کے نامور فرزند جناب کلیم الدین احمد کی کوئی سوانح عمری نہیں، بلکہ یہ ان مضامین کا ایک مجموعہ ہے جو ۱۹۷۶ء میں ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف کے ایک جشن کے موقع پر مرتب ہوا، اس میں بہار کے مشہور اہل قلم جناب قاضی عبدالودود، جناب عبدالمنان بیدل، جناب مسلم عظیم آبادی، پروفیسر سید حسن عسکری، پروفیسر سید حسن سرید، جناب عطا کاکوی، ڈاکٹر محمد محسن، ڈاکٹر عطا کریم برق اور جناب سہیل عظیم آبادی کے علاوہ باہر کے مشاہیر میں پروفیسر رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر گیان چند کے بھی مضامین ہیں، بہار کے اور دوسرے مضمون نگاروں کی تحریریں بھی ہیں جن کے انداز بیان میں خوش سلیقگی ہے، اگر انھوں نے اپنے اس وصف کے اظہار کا سلسلہ جاری رکھا تو امید ہے کہ وہ ادبی دنیا میں نمایاں مقام حاصل کریں گے، اس کے مرتب ڈاکٹر محمد حسنین (صدر شعبۂ اردو مگدھ یونیورسٹی) کی یہ خوش مذاقی ہے کہ اس میں انھوں نے اپنے ممدوح کلیم الدین احمد صاحب کی مدح و قدح دونوں پہلوؤں پر مضامین جمع کر دیئے ہیں، جن سے ان کی ادبی اور تنقیدی سرگرمیوں اور کاوشوں کو سمجھنے میں پوری مدد ملتی ہے، لائق مرتب نے اس مجموعہ کا حرف آغاز ایک پرزور اور جاندار انداز میں لکھا ہے، اس سے بھی ان کے ذوق کی ستھرائی ظاہر ہے۔

کلیم الدین احمد صاحب اردو ادب کے میدان میں بظاہر یکہ تاز بن کر اس رجز کے ساتھ اترے کہ محمد حسین آزاد اپنی رائے قائم کرنے میں عجلت سے کام لیتے تھے۔ ان کے ذہن میں اردو زبان کی پیدائش اور ترقی کے اسباب کی صحیح تصویر نہیں تھی، انھوں نے جو ساری باتیں لکھی ہیں، وہ سست بنیاد پر ہیں۔ انگریزی لالٹینوں کی روشنی ان کے دماغ تک نہیں پہونچی، ان کی رائے اکثر گول ہوتی تھی (اردو تنقید پر ایک نظر، ص ۵۳ - ۴۹) شعر و شاعری کی اہمیت کا صحیح اندازہ حالی کے بس کی بات نہیں، ان کی نظر سطحی تھی اور یہ سطحیت ہر جگہ ملتی ہے، وہ خیالات تو اخذ کر لیتے ہیں؛ لیکن ان پر کافی غور و فکر نہیں کرتے۔ ان کی جانچ پڑتال نہیں کرتے، وہ یہ بھی نہیں سمجھتے کہ بعض باتوں میں تضاد ہے۔ خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، فہم و ادراک معمولی، غور و فکر ناکافی، تمیز ادنیٰ، دماغ و شخصیت اوسط، یہ تھی حالی کی کائنات، وہ بہت سی باتوں کو سمجھ نہیں پاتے اور ان کو صاف سلجھا کر بیان بھی نہیں کر پاتے، یہ خیال کہ مقدمہ شعر و شاعری اردو میں بہترین تنقیدی کارنامہ ہے، نہایت حوصلہ شکن ہے (ایضاً ص ۱۱ — ۸۸) مولانا شبلی جو کچھ لکھتے ہیں، اس میں کوئی جدت، تازگی اور باریکی نہیں (ایضاً ص ۱۱۸ - ۱۱۲) مولانا عبد السلام ندوی کی شعر الہند کی ورق گردانی سے طبیعت میں الجھن پیدا ہوتی ہے۔ مصنف شعر الہند تنقید کے لئے نہیں پیدا کئے گئے تھے، اگر وہ یہ محنت کسی ایسے کام میں صرف کرتے جس سے ان کی طبیعت کو زیادہ مناسبت تھی تو شاید ان کی محنت مشکور ہوتی۔ ان کی طبیعت میں کچھ ایسی پراگندگی ہے کہ صفائی، ترتیب اور تناسب کسی شے کا پتہ نہیں اس کتاب کو پڑھنا گویا جہاد کرنا ہے، لیکن اس جہاد سے کوئی دینی یا دنیاوی فائدہ نہیں، ان کا اسلوب بھدا ہے، دلچسپی سے معرا اور ساری باتیں سطحی ہیں، ان کی طبیعت خشک و بے رنگ ہے، خشکی اور بے رنگی ہر جگہ ایسی پھیلی ہوئی ہے کہ پڑھنے والے کی طبیعت اکتا جاتی ہے، سخن فہمی، احساس طبیعت، مذاق صحیح، تیز و تند ادراک، ان اوصاف سے عبد السلام مبرا ہیں (ایضاً ص ۶۷) ڈاکٹر عبد الحق کو

شاعری کے اوصاف اور نظم کی خوبیوں کی ٹھیک خبر نہیں، خیالات محض اور شعری خیالات کے بین فرق سے بھی وہ آگاہ نہیں ہیں، رشید احمد صدیقی اکثر بہک جاتے ہیں، اس بہکنے کا سبب ان کی کج روی کے سوا کچھ نہیں، مطمح نظر کی تنگی اور صحیح معیار کی کمی سے اکثر نتائج ظہور میں آتے ہیں (ایضاً ص ۳۲۸)

کلیم صاحب کی ان تنقیدوں کو پڑھ کر کچھ لوگ تو یہ سمجھے کہ ان کا قلم ایک ناسمجھ چھوٹے بچے کے ہاتھ کی چھری ہے، کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ انھوں نے اردو ادب کے دریا کی پرسکون سطح پر پتھر پھینکنے کی مشق کی ہے جن سے کچھ لہریں اٹھیں گی، مگر پھیل کر نظروں سے غائب ہو جائیں گی، مگر اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ بہار کے علاوہ ہندوستان کے بعض ادبی حلقوں کی نظر ان کی طرف اٹھی کہ ان کی تنقیدی نظر کی وسعت اور گہرائی سے اردو ادب کو تنقید نگاری کا ایک نیا زاویۂ نگاہ ملیگا، بہار والوں کو یہ خیال ہونے لگا کہ اردو ادب کی تنقید نگاری کی امامت اب ان کے یہاں منتقل ہو گئی ہے مگر جب کلیم صاحب پر خود تنقیدیں ہونے لگیں تو اب ان کے مخلص پرستاروں اور غالی معتقدوں کو بھی یہ کہنا پڑا کہ وہ متنازعہ فیہ بن گئے ہیں۔

زیر نظر مجموعہ میں ان کی تعریف تو یہ کہہ کر کی گئی ہے کہ وہ اہم نقادوں میں ہیں، وہ اردو تنقید میں ایک خاص نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں جس سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی اہمیت اور تنقیدی بصیرت سے انکار نہیں کیا جا سکتا (حیات کلیم، پیش لفظ) انھوں نے اپنی تنقید میں طنز کا وہ حربہ سے وہ صرف لیا ہے جو قدرت نے قوم نوح کے لئے ابر باراں سے ..... ان کے اسلوب میں سرسید کی گرم عقلیت اور حالی کی پر خلوص سادگی ہوتی ہے، ان کی زبان اور انداز بیان سائنسی نکھرا اور اکھرا ہے (ایضاً ص ۱۲) حالی کے بعد اگر کوئی نقاد اس کثرت سے پڑھا اور لکھا گیا ہے تو وہ کلیم الدین ہیں (ایضاً ص ۱۴) وہ جو کچھ کہتے ہیں کھلم کھلا کہتے ہیں اور طنز سے خواہ خفی ہو یا جلی بہت کم کام لیتے ہیں (ایضاً ص ۶۵) ان کے معاصرین میں کوئی نقاد ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے (ص ۶۸) انھوں نے اردو انداز فکر میں

حاکیت لانے اور اس کو مستحکم بنانے میں بلا شرکت غیرے ایک ایسا اہم رول ادا کیا ہے کہ آنے والی نسلیں ان کی باج گذار رہیں گی (ایضاً ص ۱۰۰) وہ اردو تنقید کو اتنا آگے بڑھاتے ہیں جتنا اب تک کوئی نہ بڑھا سکا ...... وہ اس تاریکی میں ایک مشعل لئے ہوئے صحیح راستے کو دکھاتے ہوئے نظر آتے ہیں (ایضاً ص ۱۴۹) انھوں نے اردو تنقید کے راستے میں ایک ایسا چراغ جلا دیا ہے جس کی روشنی میں نقد ادب کی منزل صاف صاف واضح دکھائی دینے لگی ہے (ایضاً ۲۰۲ وغیرہ وغیرہ)

لیکن اسی مجموعہ کے اور دوسرے مضامین میں ان پر سخت تنقیدیں بھی کی گئی ہیں ان کی تنقید نگاری کے فن پر یہ لکھ کر ضرب لگائی گئی ہے کہ وہ تنقید میں غلو کی سرحد تک پہونچ جاتے ہیں (ص ۲۲۱) ان کا بڑا عیب یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ انتہا پسند واقع ہوئے ہیں۔ ایک طرف تو ان کا رجحان خالص ہندیت کی طرف ہے، دوسری طرف وہ نہ تنہا اپنی تنقید میں بال کی کھال کھینچتے ہیں، بلکہ وہ ہمیشہ مشرق کی ہر چیز کو مغرب کی ترازو میں تولنے کی کوشش کرتے ہیں (ص ۲۲۵) ان کی تنقید میں تعمیری پہلو کے مقابلہ میں نادانستہ تخریبی پہلو زیادہ ہے (ص ۲۲۵)

یہ ضرب لگانے میں ان کے بعض ناقدوں کا لب ولہجہ اس سے بھی زیادہ تیز ہو گیا ہے اور وہ لکھتے ہیں کہ وہ سکون اور ٹھہراو جو برسوں کے غور وفکر اور ریاضت کا ثمرہ ہوتا ہے، اس سے ان کی طبیعت کا کوئی لگاؤ نہیں معلوم ہوتا، وہ انتہا پسند ہیں، اپنی عقل اور ادراک پر انھیں اس قدر اعتماد ہے کہ دوسروں کی فکر ونظر انھیں ہیچ نظر آتی ہے، ان کے فیصلوں میں بڑی عجلت اور قطعیت ملتی ہے، کسی کا جائزہ لینے سے پیشتر انھیں اپنا جائزہ لینے کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی، وہ جب کسی پر حملہ کرتے ہیں تو اس شدومد کے ساتھ کہ ان کے ترکش میں ایک بھی تیر باقی نہیں رہتا (ص ۲۵۲)

بعض ناقد تو اشتعال اور غصہ میں یہ لکھ گئے ہیں کہ ان کی بعض رایوں پر غور کیجئے تو یہ باور کرنا مشکل ہو جائے گا کہ انھوں نے ان آراء کا اظہار بقید ہوش وحواس کیا ہے (ص ۲۵۶) ایک نقاد نے ان سے اپنی برہمی کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ انھوں نے حالی اور ان کے مقدمے پر جو تنقید فرمائی ہے اسے

پڑھ کر ان کے ابتدائی جملوں کی حیثیت بس یہ متعین ہوتی ہے کہ کوئی شخص کسی کے سر پہ جوتیاں لگاتا جائے اور کہتا جائے کہ برا نہ مانو اس سے تمھاری تحقیر مقصود نہیں، یہ تو میری جوتیاں ہیں اور میری جوتیوں سے تنقیص وتحقیر نہیں ہوتی (ص ۲۶۷)

اردو کے ایک نامور نقاد نے ان سے چڑھ کر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ جس کی کسوٹی پر میر، غالب، سودا، مومن، جوش، فیض، فراق، آزاد، حالی، شبلی، مجنوں اور سرور سب ہی ناقص ٹھہرتے ہیں، ممکن ہے کہ اس کی کسوٹی ہی میں کوئی خرابی ہو، اس نے لکھنے والے کے مافی الضمیر کو ہی سمجھنے کی کوشش نہ کی ہو، یا نفسیاتی طور پر وہ ایک ایسی شخصیت رکھتا ہو جو متوازن اور صحت مند نہیں بلکہ احساس برتری یا کہتری نے اسے مریض بنا دیا ہے (ایضاً ص ۳۵۲)

کلیم الدین احمد کے مداح ان کا بڑا وصف یہ بتاتے ہیں کہ ان کی نظر انگریزی اور فرانسیسی ادب پر بڑی گہری ہے اس لئے یوروپی طرز تنقید کو اردو میں روشناس کر کے اس کو باوزن بنایا، مگر ان کے ناقدین نے یہ لکھ کر ان کو مجروح کیا ہے کہ وہ اردو ادب کے ایوان میں مغربی چور دروازہ سے داخل ہوئے (ص ۳۱۶) یورپ والوں کا ہر پیغام ہمارے یہاں وحی کا درجہ رکھتا ہے اور اگر کوئی نہ مانے تو کافر، ہمارے اور بزرگوں کے ساتھ کلیم صاحب بھی اسی غلامی کی زنجیر میں مقید نظر آتے ہیں (ص ۲۱۹) ان کے یہاں رچرڈس کی سائنسی نظر سے زیادہ لیوس کی بت شکنی ہے، ان کے یہاں عالمی معیار ونق کا زور صحیح ہے، فارم کا احساس بھی مناسب ہے مگر ہندوستانی ادبیات کا گہرا مطالعہ اور ہندوستانی تہذیب کا عرفان نہیں، ایک کٹر حقیقت پسند ہونے کی وجہ سے وہ زندگی کے دوسرے نظریوں کا بے لاگ اور بے تعصبانہ مطالعہ نہیں کر پاتے، ان کے یہاں ذوق سلیم کے بجائے ایک سرد علمیت ہے (ص ۲۶۱) ان کا آرٹ بے مقصد اور مہمل ہے، وہ فن کار کو زندگی سے مقابلہ کرتے نہیں دیکھ سکتے۔ ان کے خیالات غیر افادی اور غیر سماجی ہیں، سمندر پار سے آئے ہوئے آقاؤں نے جو گہرے نقوش چھوڑے ہیں

ان میں روشن اور تاریک پہلو موجود ہیں، کلیم الدین کا دامن اس تاریک پہلو میں الجھ کر رہ گیا ہے، ان کی تنقید کے انداز کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ ایک بورژوائی دوسرے بورژوائی کے سامنے تقریر کر رہا ہے، (ص ۷۳ - ۲۷۲) انھوں نے غالب، مومن، ذوق، آتش اور ناسخ کے بتوں کو مغربی آلۂ تنقید کی مسلسل ضربوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، اس سے ان کو لذت ضرورت حاصل ہوئی مگر وہ خود معتوب ہوگئے (ص ۳۱۲)

کلیم الدین احمد کی یہ دو باتیں بہت عام ہوئیں، غزل نیم وحشی صنف سخن ہے، اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے، یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر، ان چونکا دینے والے جملوں سے ان کی شہرت میں اضافہ ہوا، مگر ان کے بعض نقادوں نے ان کے ان خیالات پر بھی اپنی خفگی کا اظہار یہ لکھ کر کیا ہے؛ اگر اردو میں تنقید کا وجود اسی طرح کی تنقیدوں سے ہے جس کا مظاہرہ انھوں نے کیا ہے تو اس کا فرضی وجود ہی خوب تھا (ص ۲۸۰) انھوں نے غزل کو نیم وحشی صنف سخن قرار دیا، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، ہر صنف شاعری کو غیر معیاری بتایا اور ہر شاعر کسی نہ کسی شکل میں معتوب ہوا، (سوائے عظیم الدین احمد کے) نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی شدید متعصب اور جذباتی تصانیف کے نتائج ہر نقاد کی نظر میں مایوسانہ اور غیر معتدل قرار پائے (ص ۳۶۵) کلیم الدین احمد بعض جگہ اپنی تنقید میں عجب عجب باتیں کرتے ہیں جن کو پڑھ کر ہنسی آجاتی ہے اور تعجب بھی ہوتا ہے، مثلاً یہ کہ غزل نیم وحشی صنف ادب ہے، یا یہ کہ اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے، یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر ہے، اس سے ان کی سطحیت اور جذباتیت کا اندازہ ہوتا ہے، اس کو تنقید نہیں کہا جا سکتا، ان میں تنقید کی بڑی صلاحیت تھی لیکن ان کی جذباتیت اور ان کی بدگمانی ان کو لے ڈوبی جس سے وہ کہیں کے نہیں رہے (ص ۳۷۷)

کلیم صاحب کے طرز انشا اور انداز بیان کو بھی ان کے ناقدوں نے گھائل کیا ہے، مثلاً

ایک ناقد کا خیال ہے کہ ان کا ایک اہم نقص یہ ہے کہ اردو پر انھیں عبور حاصل نہیں اردو ان کے لئے بدیسی زبان کا حکم رکھتی ہے، ان کی زبان میں ایک عجیب اکھڑا اکھڑا پن محسوس ہوتا ہے، ان کی بعض عبارتیں پڑھ کر یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اولاً وہ انگریزی میں سوچتے ہیں اور بعد میں لکھتے وقت اردو میں منتقل کر دیتے ہیں، زبان کی لطافت اور پاکیزگی تو بڑی چیز ہے، بعض دفعہ وہ اپنے مافی الضمیر کو بھی صحیح طور پر ادا نہیں کر پاتے (ص ۲۶۳)

کلیم صاحب کا عمل اپنی تحریروں اور تنقیدوں میں اس پر رہا کہ دوسروں پر اعتراض کرنے میں کوئی تامل نہیں کرنا چاہئے، اختلافات کے اظہار کرتے وقت کسی اعتذار یا نرم گوئی کی ضرورت نہیں (ص ۲۸۸) اسی لئے انھوں نے دوسروں کو خوب جلی کٹی سنائی، اسی سے فائدہ اٹھا کر ان کے ناقدوں نے بھی ان کو جلی کٹی خوب سنائی ہے، کلیم صاحب نے مولانا حالی، مولانا شبلی، مولانا عبد السلام ندوی، ڈاکٹر عبد الحق اور رشید احمد صدیقی کے لئے جتنے ناخوش گوار الفاظ استعمال کئے تھے وہ سب ان کے لئے استعمال ہو رہے ہیں۔

اب ایک شخص اپنے ذوق سلیم ہی سے فیصلہ کر سکتا ہے کہ کلیم صاحب اپنے نقادوں کے درمیان محبوب ہیں یا معتوب، ان کے مداح زیادہ ہیں یا ان کے نکتہ چیں، انھوں نے ناموری پیدا کی یا بدنامی، یا وہ محبوب بھی ہیں، معتوب بھی، نیکونام بھی ہیں اور بدنام بھی، ان کے پرستاروں اور معتقدوں کو یہ حق ہے کہ وہ اس رائے پر پہونچیں کہ کلیم صاحب کے الفاظ نقد میں ریزر کی تیز اور گہری کاٹ ہے، ان کی تنقیدوں میں وسعت نظری، استدلال کی پائداری اور ادبی اقدار کی پاسداری ہے، ان کی کتابیں اردو ادب میں کلاسیکی بن گئی ہیں، وہ اردو کے بہت بڑے محسن ہیں، اگر اردو کے پرستار ان کی خدمات کی طرف سے چشم پوشی کریں تو یہ احسان ناشناسی ہوگی، ان کی تنقیدیں عہد ساز ہیں اردو شاعری اور تنقید پر ضرب کلیمی بر وقت پڑی اور خس و خاشاک کو بہالے گئی، انھوں نے

اردو تنقید کے سفینہ کو اس وقت جب کہ یہ بحرانی حالات سے ہولناک بھنور میں پھنس چکا تھا، ڈوبنے سے بچالیا ہے، ان کی تنقیدی خدمات اردو کے سارے نقادوں سے دیتے ہیں، کلیم صاحب کے مداحوں کو مداحی کے حق سے جس طرح کوئی محروم نہیں کرسکتا، اسی طرح ان کے ناقدوں کو بھی یہ حق پہونچتا ہے کہ وہ کلیم صاحب کے متعلق یہ رائے قائم کریں کہ وہ اپنی رائے کے اظہار میں عجلت سے کام لیتے ہیں، ان کے ذہن میں اردو زبان اور اس کے شعروادب کی خوبیوں کی صحیح تصویر نہیں، انھوں نے جو باتیں لکھی ہیں ان کی بنیاد بہت ہی کمزور ہے، انھوں نے انگریزی لالٹینوں کی روشنی میں اردو کے شعروادب کو سمجھنے کی کوشش کی جو ان کے بس کی بات نہ تھی، اسی لئے ان کے یہاں ہر جگہ سطحیت ملتی ہے، وہ خیالات تو اخذ کرلیتے ہیں لیکن ان پر غور و فکر نہیں کرتے، ان کے خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، فہم وادراک معمولی، غور و فکر ناکافی، تمیز ادنی، دماغ وشخصیت اوسط، یہ ہے ان کی کل کائنات، یہ خیال کہ ان کی تنقید نگاری اردو میں بہترین کارنامہ ہے، نہایت حوصلہ شکن ہے، ان کی تنقیدوں کی ورق گردانی سے طبیعت میں الجھن پیدا ہوتی ہے، ان کی کتابوں کا پڑھنا گویا جہاد کرنا ہے لیکن اس جہاد سے کوئی دینی یا دنیاوی فائدہ نہیں، ان کا اسلوب بھدا ہے، دلچسپی سے معرا، ان کی طبیعت خشک اور بے رنگ ہے، خشکی اور بے رنگی ہر جگہ ایسی پھیلی ہوئی ہے کہ پڑھنے والے کی طبیعت اکتا جاتی ہے، وہ اپنی تنقیدوں میں اکثر بہک جاتے ہیں، اس بہکنے کی وجہ ان کی کج روی کے سوا کچھ نہیں، مطمح نظر کی تنگی اور صحیح معیار کی کمی سے ان کے اکثر نتائج غلط ہوتے ہیں الخ الخ

ممکن ہے کہ کلیم صاحب کے ناقدوں کی اس قسم کی تنقیدوں کو واسوخت سمجھا جائے، مگر اردو کی تنقید نگاری میں واسوخت کی ابتدا، کلیم احمد صاحب ہی نے کی ہے، واسوخت کے ذریعہ سے ایک نامراد عاشق اپنی زندگی کی تلخیوں اور محرومیوں کو بھول جانا چاہتا ہے، کلیم صاحب کے اس نفسیاتی تجزیہ کی شدید ضرورت ہے کہ

آخر ان کی زندگی میں کون سی محرومیاں تھیں جن سے انھوں نے اپنی تنقیدوں میں واسوخت کا رنگ اختیار کیا اس مجموعہ کے پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس واسوخت کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ ایک آدمی کی حیثیت سے نارمل نہیں، کیونکہ اسی مجموعہ سے یہ معلوم ہوا کہ ان سے کسی کتاب کے متعلق سوال کیا جاتا ہے تو جواب دینا تو درکنار ٹالنے کی بھی کوشش نہیں کرتے (ص ۶۴) وہ اپنی طالب علمی کے زمانہ میں کسی ہم جماعت سے بات چیت بھی نہیں کرتے تھے، (ایضاً ص ۶۵) وہ ضروری سوالات کا اب بھی بعض اوقات جواب نہیں دیتے (ایضاً ص ۶۸) ان کے ایک معاصر نے لکھا ہے کہ کلیم الدین احمد نہ آدمی ہیں اور نہ حیوان، آپ جب پہلی بار ان کے روبرو ہوں گے تو آپ محسوس کریں گے کہ ایک بے جان پتلا ہے آپ کے مقابل کرسی پر بٹھا دیا گیا ہے جس کے اندر کچھ ایسے کل پرزے کام کر رہے ہیں کہ اس کے سر میں تھوڑی دیر بعد اتباتی انداز سے جنبش ہوجاتی ہے اور لبوں پر ایسی شکنیں نمودار ہوجاتی ہیں جن سے مسکراہٹ کا گمان ہوتا ہے (ایضاً ص ۱۹۳) جب ان کی شادی ہوئی تو ان کے والد ڈاکٹر عظیم الدین کے بے تکلف دوست نے ان سے سوال کیا کہ کلیم الدین نے دلھن کی طرف التفات کیا یا نہیں، ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ شادی کے دوسرے دن دلھن کو بخار آگیا، اور انھوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا، تھرمامیٹر کلیم الدین کے حوالہ کرکے انھیں تاکید کی کہ ہر چار گھنٹوں پہ دلھن کا ٹمپریچر لے کر اس کی نقل رکھیں تاکہ ڈاکٹر کو مرض کی تشخیص میں سہولت ہو (ص ۱۹۰)

یہ تصویر کسی نارمل آدمی کی نہیں، پھر ظاہر ہے کہ ان کی تنقیدیں نارمل کیسے ہوسکتی تھیں، وہ ابھی زندہ ہیں، ان کو کسی نفسیاتی دار العمل میں لے جاکر ان کا یہ جائزہ لیا جاسکتا ہے کہ وہ نارمل کیوں نہیں ہیں، پھر اس کا فیصلہ خود بخود ہوجائے گا کہ ان کی تنقیدیں نارمل کیوں نہیں ہوسکیں۔

کلیم الدین صاحب نے محمد حسین آزاد کو یہ لکھ کر گھائل کیا تھا کہ آب حیات کا اہم ترین عیب اس کی انشا ہے (اردو تنقید پر ایک نظر ص ۴۹) یہ کوئی تنقید نہیں ہے بلکہ یہ آرڈیننس ہے، اب یہی آرڈیننس

ان پر بھی نافذ کیا جاسکتا ہے۔ ان کے بعض ناقد لکھتے ہیں جیسا کہ اوپر کے اقتباسات سے ظاہر ہے کہ ان کا اہم نقص یہ ہے کہ اردو پر انھیں عبور نہیں، ان کی زبان میں ایک عجیب اکھڑا اکھڑا پن محسوس ہوتا ہے زبان کی لطافت اور پاکیزگی تو بڑی چیز ہے بعض دفعہ وہ اپنے مافی الضمیر کو بھی صحیح طور پر ادا نہیں کر پاتے، یہ کہنا تو صحیح نہیں کہ وہ اپنے مافی الضمیر کو ادا نہیں کر پاتے، ان کا بڑا وصف تو یہی ہے کہ وہ جو کہنا چاہتے ہیں، پوری طاقت کے ساتھ کہہ جاتے ہیں۔ البتہ ان کے کہنے کے انداز میں لطافت نہیں ہوتی، اکھڑا اکھڑا پن ہوتا ہے۔ مگر ان کے مداح ان کی اسی زبان اور انداز بیان کو سائنسی کہتے ہیں، کھرا اور اکھرا (ص ۱۲) ان کی زبان اور انداز بیان کو عقیدت اور محبت میں سائنسی کہہ لیا جائے مگر ان کی غلطیاں نکالی جائیں تو ان کی ناموری میں بدنامی کی لہر اتنی تیز ہو جائے کہ کلیم الدین احمد صاحب ہی کی طرح بعض دل کے پھپھولے توڑنے والے اور دل جلے ناقد کہہ اٹھیں گے کہ جو صحیح اردو لکھنے کے مذاق سے عاری ہو اس کو اردو کے شعر و ادب میں تنقید کرنے کا کیا حق تھا، زیر نظر کتاب میں کلیم الدین احمد صاحب نے "اپنی تلاش" میں جو کچھ لکھا ہے وہ دلچسپی سے ضرور پڑھا جائے گا، لیکن عقیدت یا تعصب کی عینک اتار کر ناقدانہ مطالعہ کیا جائے تو اس کا کوئی صفحہ ایسا نہیں جس میں زبان اور انداز بیان کی خامیاں نظر نہیں آئیں گی۔ اس مجموعہ کے مرتب ڈاکٹر سید محمد حسنین اردو کے بڑے اچھے معلم ہیں، انھوں نے جو حرف آغاز لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو لکھنے کا اچھا ذوق رکھتے ہیں، وہ سرخ روشنائی سے کلیم الدین احمد صاحب کی اس تحریر کو صحیح کرنے بیٹھیں تو اس کے سارے صفحات ان کی اصلاحات سے رنگے نظر آئیں گے، کلیم الدین احمد صاحب کا لب و لہجہ تھوڑی دیر کے لیے مستعار لیا جائے تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کی بعض عبارتیں تو اسکول کے نیچے درجے کے لڑکوں کی سی ہیں، بعض ایسی ہیں جیسے امتحان کے کمرے میں لمبے وقت کی کمی کی وجہ سے آخر وقت میں کچھ نہ کچھ گھسیٹ کر لکھ دیتے ہیں، وہ روزمرہ اور محاوروں کی تو پرواہ ہی نہیں کرتے، ان کے نزدیک فاعل، فعل اور مفعول کے استعمال میں تقدم و تاخر کی کوئی اہمیت ہی نہیں، جملوں کی ساخت اچھی ہو یا بری

اس کا بھی لحاظ نہیں کرتے، "تھے" لکھنے پر آتے ہیں تو اس کے لکھنے میں مطلق تکان محسوس نہیں کرتے، ان کے مضمون کے ص ۱۹ کی نو سطروں میں سترہ دفعہ "تھے" کا استعمال ہوا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود زوائد، غرابت، تنافر اور فصاحت وغیرہ کی تعریف سے بالکل ہی واقف نہیں، بعض الفاظ کے صحیح استعمال کی عدم واقفیت کا بھی اظہار ہوتا ہے، اپنی ان خامیوں کے باوجود ان کو یہ لکھنے میں تامل نہ ہوا کہ آب حیات کا اہم ترین عیب اس کی انتشار ہے، مولانا عبد السلام ندوی کا اسلوب بھدا ہے۔

پٹنہ یونیورسٹی کے سابق اساتذہ جناب عطا کاکوی اور جناب سید حسن سرمد اور خود اس مجموعے کے مرتب ڈاکٹر محمد حسنین حسب ذیل جملوں کو سامنے رکھیں اور خود فیصلہ کریں کہ وہ ان کو لکھتے تو کس طرح لکھتے

یہ کہنا مشکل تھا کہ میں آگے چل کر کیا کروں گا، عربی لوں گا، سائنس لوں گا، تاریخ لوں گا، یا انگریزی لوں گا (ص ۲۰) پٹنہ کالج دیکھا تھا، لیکن دیکھنے سے زیادہ اس کا شہرہ سنا تھا اور پٹنہ کالج سے زیادہ اس کے پرنسپل مسٹر جیکسن کا شہرہ سنا تھا.... ان کی قابلیت کا شہرہ نہ تھا (ص ۲۱) کہتے تھے کہ ایسا کوئی دوسرا اکنومکس کا پروفیسر انھوں نے نہیں دیکھا (۲۱) ہملٹن چالیس پینتالیس منٹ میں اتنا پڑھا لیتے تھے کہ دوسرے پروفیسران دو گھنٹوں میں نہیں بتا سکتے تھے..... ہملٹن نے استعفیٰ دے دیا، اور انگلینڈ واپس چلا گیا جہاں اسے بہت اچھا پوسٹ مل گیا (ص ۲۱) جیکسن تو بے صبر آدمی تھے، (ص ۲۲) وہ مجبوری پرنسپل کے آفس میں گیا (ص ۲۲) میں پرنسپل پٹنہ کالج ہوں (ص ۲۳)، عربی میں آنرز نہیں لیا، فلسفے میں بھی آنرز نہیں لیا، یہ دو امکانات بھی تھے (ص ۲۴)، کچھ لڑکوں نے بھی نعرہ بازی شروع کی (ص ۲۵) قابلیت کا ان کی سب اعتراف کیا کرتے تھے (ص ۲۴)، بولتے تھے اس قدر صاف اور آہستہ اور آواز بھی ایسی بلند تھی کہ ہر لفظ سمجھ میں آجاتا تھا (ص ۲۵) کچھ دنوں کے بعد دربار ڈے کے روز چھٹی ہوئی لیکن کوئی ٹنگ نہیں ہوئی (ص ۲۶) ان کی بیوی اور بچی ہلاک ہوگئی تھیں (ص ۲۶) پست قد، موٹے اور چندے سے

آدمی تھے (ص ۲۷) ان کے کلاس بہت بورنگ ہوتے تھے (ص ۲۸) ان کی تقرری ہوئی تھی (ص ۳۰) کلاس ون کا پوسٹ خالی ہوا تو اُسے اشتہار کے ذریعہ بھرا گیا (ص ۳۱) کام کی باتیں کسی نے کہیں تو نوٹ کرلی (ص ۳۴) انھوں نے مجھ سے کچھ باتیں کرنی چاہی (ص ۳۵) دوسرے ٹیچ پر چلے گئے (ص ۳۵) اباجان کی سب سے قریب رشتے کی بھی بہن تھیں (ص ۴۶) ہم دونوں چہرہ بچہرہ ہیں (ص ۴۸) وغیرہ وغیرہ۔

کلیم الدین احمد صاحب بہت سی کتابیں لکھ چکے ہیں، وہ زیادہ کتابوں کے لکھنے والوں کو اچھا مصنف نہیں سمجھتے، اس لئے اب وہ کوئی اور کتاب لکھنے کے بجائے اپنی ساری تصانیف کی زبان پر صرف نظرثانی کرتے رہیں اور اس کو صحیح، فصیح اور سجل کردیں، تاکہ انھوں نے اپنی تنقید نگاری کا جو چراغ آیندہ نسلوں کے لئے روشن کیا ہے وہ زبان اور انداز بیان کی خامیوں کی وجہ سے بجھنے نہ پائے۔

انھوں نے اپنی خود نوشتہ سوانح عمری میں لکھا ہے کہ ان کا جب جنازہ اٹھے گا تو نہ عبرت سر جھکائے گی اور نہ حیرت آئینہ دیکھے گی، مگر ہم ان کے پرستاروں ہی کی طرح ان کو یقین دلاتے ہیں کہ ان کے جنازے کے ساتھ لوگوں کی آنکھیں نم ہوں گی، ان کے سر غم کے بوجھ سے جھکے ہوئے ہوں گے اور وہ مدت مدید تک یاد آئیں گے، کچھ لوگ تو ان کو اس حیثیت سے یاد کریں گے کہ وہ ایک مست ہاتھی کی طرح اردو کی تنقید نگاری کے شیش محل میں داخل ہوئے اور اس کے درو دیوار کو منہدم کرنے کی کوشش کی، کچھ لوگ ان کو یاد کرکے کہہ اٹھیں گے کہ اردو دنیا ان سے بڑا طنز نگار نقاد پیدا نہ کرسکی، کچھ لوگوں کے ذہن میں ان کی یاد دل کا چراغ اس لحاظ سے بھی روشن رہے گا کہ بڑے بڑے قلمی پہل تن اور ادبی تہمتن ان کو پچھاڑنے کی فکر میں لگے مگر انھوں نے پچھڑنا گوارا نہیں کیا، کچھ لوگوں کے دل میں ان کی یاد اس لحاظ سے

آئے گی کہ انھوں نے اردو کے نقادوں کو اپنے سامنے جھکانے کی کوشش کی، مگر وہ جھکنے کے بجائے خود ان کو جھکانے پر آمادہ ہوگئے، ان کا یہ وصف بھی یاد آئے گا کہ انھوں نے دوسروں پر وار کیا اور دوسروں پر پتھر پھینکے تو خود اپنے اوپر وار کو سہنا اور دوسروں کے پتھروں کی چوٹ کو برداشت کرنا سیکھا، کچھ لوگ ان کو اس لحاظ سے بھی یاد کریں گے کہ وہ بدنام ہوکر بھی اپنے پیچھے اپنا نام چھوڑ گئے۔

مطبوعات جدیدہ

ابن الفارض :۔ مرتبہ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ عمدہ ٹائپ بہتر، صفحات ۲۲۵، قیمت تحریر نہیں، پتہ : ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

شیخ ابن الفارض ساتویں صدی کے مشہور صوفی اور عربی کے نامور شاعر تھے، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ صاحب سابق ریڈر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی نے چند برس قبل ان پر ایک طویل مقالہ لکھا تھا جو معارف کے سات شماروں میں مسلسل شائع ہوا تھا، اب انھوں نے اس کو ترمیم و اضافہ کے بعد کتابی صورت میں شائع کیا ہے، یہ چھ ابواب پر مشتمل ہے، شروع کے دو باب شیخ کے حالات و اخلاق کے لئے مخصوص ہیں اور آخر کے چار ابواب میں شعر و تصوف میں ان کے کمال کا ذکر ہے۔ لائق مصنف نے شیخ کی شاعری پر مفصل تبصرہ کیا ہے، ان کے دیوان میں جن اصناف و موضوعات سے تعرض کیا گیا ہے، ان کا تجزیہ کرکے کلام کی اہمیت، مقبولیت، خصوصیت اور محاسن دکھائے ہیں، شیخ اصلاً صوفی تھے، اس لئے تصوف کی اصل حقیقت اور اس کے ضروری اور اہم مسائل پر مختصر گفتگو کرکے ان کے بارہ میں شیخ کے افکار و خیالات کی تشریح کی گئی ہے، آخر میں کئی انڈکس بھی ہیں، یہ کتاب تلاش و تفحص سے لکھی گئی ہے، اس سے شیخ کے دقیق صوفیانہ اشعار کی توضیح کا حق ادا ہو گیا ہے، فارسی کی صوفیانہ شاعری کے مقابلہ میں عربی کی صوفیانہ شاعری کا درجہ بلند نہیں، اس پر اردو میں ابھی تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی، اس لحاظ سے یہ کتاب اردو کے ذخیرہ میں اچھا اضافہ ہے جو علمی و ادبی حلقوں کے خیر مقدم کے لائق ہے، ص ۱۴۴ پر حافظ ابن حجر کے ایک ہم عصر شیخ مدین کا ذکر ہے، اگر ان پر مختصر نوٹ دے دیا جاتا تو اچھا ہوتا، کیونکہ عموماً شیخ مدین کے

حضرت شعیبؑ کی جانب ذہن منتقل ہوتا ہے۔

نوح ناروی :۔ مرتبہ ڈاکٹر ظفر الاسلام ظفر، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۷۸ مجلد مع گردپوش، قیمت ۲۵ روپئے : (۱) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی (۲) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نزد جے جے اسپتال، پرنس بلڈنگ، بمبئی ۳

یہ کتاب لائق مصنف کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر بمبئی یونیورسٹی نے ان کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی ہے اس کے چھ ابواب میں نوح ناروی کے حالات و کمالات کا مرقع پیش کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں ان کے حالات کے ضمن میں خاندان، تعلیم، بیوی، بچوں، داغ سے تلمذ اور دوسرے معاصرین سے ان کے تعلقات اور مذہبی عقائد کا ذکر ہے، دوسرے باب میں حیدرآباد کے سفر اور داغ کی خدمت میں حاضری کا بیان ہے، تیسرے میں ان کی مقبولیت کے اسباب اور چوتھے میں تصنیفات کا تعارف کرایا گیا ہے، پانچویں باب میں تلامذہ کا تذکرہ، نوح کی اصلاح دینے کے طریقے اور جدید ادبی رجحانات سے ان کی واقفیت کا ذکر ہے، چھٹے باب میں ان کی شاعری پر مبسوط تبصرہ کیا گیا ہے، اس میں کلام کی نمایاں خصوصیات کے علاوہ زبان و بیان کی صحت کے معاملہ میں ان کی غیر معمولی توجہ محاورات کی پابندی اور متروکات سے اجتناب وغیرہ پر مفصل بحث ہے، آخر میں دو ضمیمے بھی ہیں، جن میں ان کی دو نثری تحریریں درج ہیں، چھٹا باب زیادہ اہم ہے، اس سے مصنف کی تلاش و محنت اور ادبی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے، ایک جگہ انھوں نے مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کی اس رائے کو غیر منصفانہ قرار دیا ہے کہ "داغ کے رنگ میں تو ترقی کی گنجائش ہی نہ تھی، اس لئے ان کے تلامذہ نے صرف اس کو قائم رکھا" (ص ۱۷۲) حالانکہ انھوں نے خود جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی بڑی حد تک اسی خیال کی تائید ہوتی ہے، روداد میں (دیباچہ ص ۲) صحت (۱۴۳) اصلاحوں (۱۵۶) نازک مزاجی (ص ۱۷۸) کو مذکر، عہد (ص ۱۰) کو مونث اور معلومات (ص ۲۶

ومضامین (ص ۱۳۵) کو واحد استعمال کیا ہے، ذکور (نرینہ اولاد) کا املا ذکور (ص ۵) صغرسنی کا صغیر سنی (ص ۶، ۹، ۲۲) بذلہ سنج کا بزلہ سنج (ص ۶۵) لکھا گیا ہے، مصنف نے نوح کے وطن کو کہیں نارہ، کہیں نار لکھا ہے، عبارت کے الجھاؤ اور حشو وزوائد کی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں "نوح کی والدہ کے علاوہ شیخ علم الہدیٰ کو کوئی دوسری اولاد نہ تھی، حالانکہ شیخ صاحب کے بھائی اور خاندان کے بیشتر افراد موجود تھے، جب ان کا انتقال ہوگیا تو ان کی اہلیہ یعنی نوح کی نانی اپنی لڑکی کے پاس چلی آئیں" (ص ۶) " ان سے کسب فیض کا بڑا ناز تھا (ص ۲۷)

.... مطالعہ کا نہایت صاف ستھرا اور مفاد آمیز ذوق رکھتے تھے (ص ۶۲)

زبان کی شاعری کے ذریعہ سے مرزا داغ اردو کی جو بیش بہا خدمت انجام دے رہے تھے (ص ۱۴)

ان کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہ کیا (ص ۱۳۹) کوئی خاص طریقہ شاگرد کرنے کا نہیں تھا" (ص ۱۵)

کتابت کی غلطیاں بھی متعدد ہیں لیکن ان خامیوں کے باوجود کتاب دلچسپ اور پُر از معلومات ہے اور مصنف نے اس کی تیاری میں خاصی محنت کی ہے، نوح ایک اہم غزل گو تھے اور اساتذہ سخن میں ان کا شمار ہوتا تھا اور داغ کے جانشین سمجھے جاتے تھے مگر ابھی تک ان پر تحقیقی کام نہیں ہوا تھا، اس کتاب سے اس کا آغاز ہوگیا ہے۔

عورت تہذیب کے دوراہے پر :۔ از مولانا محمد ایوب اصلاحی، تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۱۰، قیمت ؁ پتہ :۔ اسلامک پبلشرز، رام پور (یو، پی)

اس میں اسلامی نقطہ نظر سے عورت کی عظمت اور اصلاح معاشرت اور افراد کی سیرتوں کی تعمیر و تشکیل میں اس کی اہمیت اور ذمہ داری بیان کی گئی ہے اور پردہ کی ضرورت، بے پردگی کے نقصانات اور زندگی کے مختلف شعبوں میں اس کے حصہ لینے کے جائز و ناجائز حدود بھی بتائے گئے ہیں، نیز اس کی تردید کی گئی ہے کہ "اسلام عورتوں کی تعلیم کا مخالف ہے" اس سلسلہ میں طالبہ مطالعہ کے لئے مفید

اور ضروری باتیں بھی درج ہیں، مگر کتاب کا نام غیر سنجیدہ اور اس کے مندرجات کے لحاظ سے بے جوڑ ہے۔

اچھے لوگ :۔ مرتبہ جناب عرفان خلیلی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۱۴۴، قیمت ۵؍ پیسے پتہ : اسلامک پبلشرز، رام پور، یو، پی۔

یہ دراصل احادیث کا انتخاب ہے، اس میں مختلف عنوانات جیسے اچھا مسلمان، اچھا نمازی، اچھا شوہر، اچھا معلم اور اچھا تاجر وغیرہ کے تحت منتخب حدیثیں جمع کی گئی ہیں اور ان کی روشنی میں ان لوگوں کے مثبت و منفی اوصاف بیان کئے گئے ہیں، اس طرح کے مجموعے پہلے بھی اردو میں چھپے ہیں، تاہم یہ فائدہ سے خالی نہیں، زبان وطرز بیان آسان ہے۔

یہ ہندوستان :۔ مترجم جناب رام سرن چوپڑہ صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۱۹۴، مجلد، قیمت عہ؍ ناشر پبلیکیشنز ڈویژن وزارت اطلاعات ونشریات حکومت ہند، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی۔

اس کتاب میں بچوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ وہ ملک کا ایک جز بن کر اس کے دکھ سکھ میں برابر کے شریک ہوں اور مشترکہ خاندان کے ہر فرد کی طرح سب مل جل کر ملک کی ترقی، بھلائی اور خوش حالی کے لئے کام کریں، اس سلسلہ میں آزادی سے پہلے اور بعد کی حالت کا نمایاں فرق اور پچیس ۲۵ سال کے اندر قومی حکومت کے پنجسالہ منصوبوں کی بدولت ہونے والی غیر معمولی ترقی کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہے، بچوں کی دلچسپی کے لئے سہل پیرایہ اختیار کیا گیا ہے اور ہر مضمون کے ساتھ اس کے مناسب تصویریں بھی دی گئی ہیں، مصنف نے ملک کے کلچر کے ضمن میں جن متبرک چیزوں کا ذکر کیا ہے، ان کا صرف ایک ہی مذہب سے تعلق ہے، لیکن کیا اچھا ہوتا کہ دوسرے مذاہب کے متبرک مقامات کا ذکر بھی کر دیتے تاکہ ہندوستان کی صحیح تصویر

نگاہ کے سامنے آجاتی، یہ کتاب ہندی سے ترجمہ کی گئی ہے اس لئے اس کے اسلوب کا اثر اردو ترجمہ میں بھی آگیا ہے، زبان و بیان کی خامیوں کے علاوہ کہیں کہیں جملے بھی غیر مربوط اور غلط ہیں، مثلاً چونکہ ہم نے پہلے کام پہلے کرنے ہیں اس لئے سوچو کہ جب تک ہر ہندوستانی پوری طرح پنپ نہیں پاتا اور انسان کی زندگی بسر نہیں کرتا ہمیں قدم بہ قدم ابھی کتنا لمبا راستہ طے کرنا ہے (ص ۸۶) اگر سرکار ہر ایک کو اس کی ضرورت کی ہر چیز مہیا کرنا چاہے اور اس کے لئے کتنی بھی کوشش کیوں نہ کرے وہ صرف وہی کچھ دے سکتی ہے، جو اس کے پاس ہے (ص ۸۷) یاد رکھو کہ امیروں نے کتنی بھی دولت کیوں نہ جمع کر رکھی ہو تمھیں اس دولت کو ساٹھ کروڑ انسانوں میں بانٹنا ہوگا، تب کہیں جاکر تمھیں معلوم ہو سکے گا کہ ہر ہندوستانی کو کیا کچھ ملے گا، نہیں اس طرح سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا (ص ۸۷) تمھیں اور مجھے اور ہم سب کو ہر چیز کی پیداوار بڑھانے میں ملک کی جو کچھ بھی ہم سے بن پڑے مدد کرنا چاہئے (ص ۸۷) چونکہ ہم ایک غریب ملک ہیں (ص ۱۱۳) گاؤں کے آس پاس کوئی اسکول نہ تھے (ص ۱۳۶) یہ ایسے منظر ہیں (ص ۱۳۸) گھروں میں نہ کرسی میز (ص ۱۳۸) ایک بات پتہ چل جائے گی (ص ۱۴۴) ہم ایک غریب ملک سہی، ترقی یافتہ ملکوں میں بچوں کے دل اچاٹ ہو جاتے ہیں، کیونکہ انھیں ہر طرح کی تفریح اور کھیل تماشے میسر ہیں (ص ۱۵۶) کھیت میں تو اتنا ہی پیدا ہوتا ہے، چاہے وہ اس پر کام کریں یا نہ کریں، (ص ۱۶۶) یہ لوگ اس لئے ہندوستان آئے ہیں کیونکہ وہ کسی نئی چیز کی تلاش میں ہیں (ص ۱۶۷) یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے اگر دنیا کے سبھی ملک اپنے آپسی مسئلوں کو دوستانہ طریقے پر سلجھانے کی کوشش کریں اور ایک دوسرے کے کام میں ہاتھ بٹائیں (ص ۱۸۴) اظہار تشکر میں بچے جگہ جنھوں لکھا ہے اور ہر جگہ غلط ہے جیسے "ہم ممنون ہیں یونائٹیڈ سروس انسٹی ٹیوشن آف انڈیا نئی دلی کی لائبریری کے جنھوں نے مدد و اعانت کی" اس قسم کی اور بھی غلطیاں ہیں پبلیکیشنز ڈویژن ایک سرکاری ادارہ ہے اس کی طرف سے شائع ہونے والی کتاب میں زبان و بیان کی غلطیوں کا ہونا بہت افسوسناک ہے اس کے لئے ایک اچھے مترجم کی خدمات حاصل کرنا مشکل نہ تھا،

"ض"

جلد ۱۲۱　ماہ ذی الحجہ ۱۳۹۷ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۷۷ء　عدد ۶

مضامین

مقالات

ادبیات